اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ، دسمبر ۲۰۲۱ء

بانی

ابن الحسن عباسی

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۳، جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ، دسمبر ۲۰۲۱ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدائے نخیل	ادب کو مورچہ نہ بنائیں!.....................	مدیر کے قلم سے.........	۰۳
تعلیم وتربیت	دعا۔۔۔!.................................	مولانا ابن الحسن عباسیؒ....	۰۶
سوزِ دل	جنت کا شوق، ہماری ضرورت................	مولانا بدر الحسن قاسمی.....	۰۸
گلہائے رنگارنگ	حکمت ودانش کے کچھ ہیرے موتی..........	ڈاکٹر تحسین فراقی........	۱۱
میرا مطالعہ	میری علمی ومطالعاتی زندگی................	مفتی امداد اللہ انور.......	۱۵
اصلاحِ معاشرہ	علاج اس کا بھی اے چارہ گراں!............	محمد بشارت نواز..........	۲۲
علم وتحقیق	تمدن کیا ہے؟..........................	مولانا طارق علی عباسی....	۲۷
یادگارِ زمانہ	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔۔۔بحیثیت ادیب	مولانا محمد زبیر...........	۳۱
کارِ جہاں بینی	رسائل ومجلّات کی اہمیت..................	مولانا عبد المتین منیری....	۳۹
مراسلے	ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے نام مولانا دریابادی کے چند خطوط	پروفیسر عظمت حیات.....	۴۴
کتب نما	ماہنامہ ''الحق'' کا شاہکار مولانا سمیع الحق شہید نمبر.	مولانا محمد شفیع چترالی.....	۵۳
طب وصحت	ذیابیطس کتنی بڑی مصیبت ہے؟.............	وسعت اللہ خان.........	۵۶
مسافرانِ آخرت	مولانا حافظ نثار احمد الحسینیؒ	ادارہ..................	۵۹
اردو ادب	تو کیا ''بربریت'' بُری بات ہے؟.............	احمد حاطب صدیقی.......	۶۰
مسافرانِ آخرت	مولانا محمد نعمت اللہ چترالی..................	ادارہ..................	۶۴

فی شمارہ:.... 60روپے **سالانہ زرِ تعاون :**.... 600 روپے

خط وکتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷ / دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس: alnakhil786@gmail.com

صدائے تخییل

ادب کو مورچہ نہ بنائیں!

مدیر کے قلم سے

عروس البلاد کراچی میں گزشتہ کئی برسوں سے آرٹس کونسل کراچی کے زیرِ اہتمام ''عالمی اردو کانفرنس'' منعقد کرنے کا سلسلہ جاری ہے جس میں ہر سال کچھ نیا پن، جدت، تنوع اور توسع لانے کی کوشش ہو رہی ہے اور کانفرنس کو باقاعدہ ادبی میلے کا درجہ دیا جا رہا ہے جس میں ادیبوں، شاعروں، مصنّفین، فنکاروں اور شائقین فن و ادب کے ساتھ ساتھ اب مقامی اور بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں اور کچھ سماجی تنظیموں (این جی اوز) کی دل چسپی اور شراکت بھی پہلے سے زیادہ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح گزشتہ کچھ برسوں سے لاہور میں ''فیض میلہ'' کے نام سے ادبی و ثقافتی ہلہ گلہ کا اہتمام ہوتا ہے اور مقامی و بین لاقوامی میڈیا پر اسے خوب اہتمام کے ساتھ شائع اور نشر کروایا جاتا ہے۔اس سال کی ''عالمی اردو کانفرنس'' میں بھی مشاعروں اور مذاکروں کے علاوہ کئی کتابوں کی مہورت ہوئی اور متعدد موضوعاتی مجلسیں بھی منعقد کی گئیں۔

کسی بھی معاشرے میں ادبی سرگرمیوں، مشاعروں، مذاکروں اور نقد و جرح کی محفلوں کے انعقاد کی ضرورت و اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ادیب، شاعر، صحافی، کاتب، متکلم اور فن کار سماج کے ترجمان اور لسان ہوتے ہیں اور ان کی تخلیقی کاوشیں معاشرے میں فکری بالیدگی کی پرورش اور ہر قسم کی گھٹن کو دور کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو معاشرے میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے اور بادشاہوں اور حکمرانوں نے سماج پر علمی و ادبی طبقے کے اثرات کی اہمیت کو تسلیم کر کے علمی ادبی سرگرمیوں کی

حوصلہ افزائی کی ہے۔

اس لیے ''عالمی اردو کانفرنس'' جیسی سرگرمیوں کو اصولی طور پر مثبت زاویہ نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے اور اس امر میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس وقت جس طرح کی گھٹن، عدم برداشت، مایوسی اور عمومی اضطراب کی ایک فضا پائی جاتی ہے جس کے مظاہر ہم روزانہ کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل، فساد اور بگاڑ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، ادب کی بادِ نسیم ہی اس فضا کو دور کر سکتی ہے اور اس کے لیے نوجوان نسل کو فن اور تخلیق کے میدانوں سے روشناس کرانا ازحد ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ادبی کانفرنسوں، مشاعروں اور مذاکروں کا انعقاد وقت کی ضرورت ہے اور وہ تمام لوگ تحسین اور تبریک کے مستحق ہیں جو اس جذبے کے ساتھ ملک میں ادبی سرگرمیوں کا انعقاد کرتے اور اپنے وطن کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

مگر مقطع کی سخن گسترانہ بات یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں قومی یا بین الاقوامی سطح کا کوئی بھی ایونٹ ہماری اپنی طبع زاد سوچ، سوچی سمجھی حکمت عملی یا ملی وملکی مقاصد واہداف کے تحت نہیں ہوتا بلکہ بالعموم اس طرح کی سرگرمیوں کے پیچھے باہر کی کچھ قوتوں کا مخصوص ایجنڈا کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال حالیہ دنوں لاہور میں منعقد ہونے والی ''عاصمہ جہانگیر کانفرنس'' ہے جس کا بظاہر مقصد ملک میں آئین وقانون کی بالادستی کے قیام کی ضرورت کا بیان تھا لیکن وہاں پاکستان کی سپریم کورٹ بار کونسل کے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے جس طرح تین دن تک آئین پاکستان، ریاست پاکستان اور پاکستان کی مسلح افواج اور مذہبی قوتوں کو تنقید وتضحیک کا نشانہ بنایا جاتا رہا، اس سے اس کانفرنس کا اصل ایجنڈا کھل کر سامنے آ گیا اور دیکھنے والوں کو اندازہ ہو گیا کہ کانفرنس کے اسٹیج کی پشت پر لگے بینر پر بعض یورپی ممالک کے اداروں اور این جی اوز کے ''لوگو'' کس مقصد کے تحت لگائے گئے تھے۔ تقریباً یہی کچھ لاہور کے فیض میلہ اور کراچی کی عالمی اردو کانفرنس میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس کانفرنس کے مختلف سیشنوں کی جو روداد شائع ہوئی اور الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا پر دیکھی اور سنی گئی، اس میں

وہی ''مزاحمتی'' رجحان غالب نظر آیا ہے۔ معاشرے کی خرابیوں کو اجاگر کرنا تو ادب کا وظیفہ کہلاتا ہے لیکن ہر خرابی کی تان مذہب اور اہل مذہب بالخصوص ''ملا'' پر پر لا کر توڑنا کس کا ''وظیفہ'' ہے، یہ امر قابل غور ہے۔ بے شک معاشرے کے کسی بھی طبقے کی طرح ملا بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہے، ہمارے ادبی ورثے میں جتنی تنقید ''ملا'' پر ہوئی ہے، شاید کسی اور پر ہوئی ہو، یہ سب اگر ادیبوں اور شاعروں کے اپنے احساسات کی بات ہے تو بھی ٹھیک ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ایجنڈے کے تحت کیا جا رہا ہے اور ایجنڈا وہی ہے جو علامہ اقبال کی تمثیلی نظم میں ابلیس کی مجلس شوریٰ نے طے کیا تھا ؎

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج　　ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو!

پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ اسی دسمبر میں کراچی میں عالمی کتب میلہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ اس کتب میلے سے متعلق ہر سال یہ رپورٹ آتی ہے کہ اس میں سب سے زیادہ دینی کتابیں فروخت ہوتی ہیں، خریدار بھی زیادہ تر دینی ذہن کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں ادب کا بڑا ذخیرہ دینی کتابوں اور تحقیقات پر مبنی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اردو ادب میں ایک بڑا حصہ حمد و نعت اور منقبت پر مبنی شاعری کی کتابوں کا بھی ہے۔ محفل حمد و نعت بھی ہماری ادبی روایت کا حصہ ہے۔ اس کے باوجود ''عالمی اردو کانفرنس'' میں کسی دینی کتاب کی رونمائی ہوتی ہے نہ کسی دینی محقق و مصنف کی کوئی پذیرائی کی جاتی ہے، حمد و نعت کی کوئی محفل سجائی جاتی ہے نہ سیرت و حدیث پر کوئی مذاکرہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی ادبی سرگرمیاں ہمارے سماج کے ادبی منظر نامے کی مکمل عکاسی نہیں کرتیں۔

ہمیں ادب کو ادب کے درجے میں ہی رکھنا ہوگا، اسے تہذیبی جنگ میں مخصوص قوتوں کے نظریات و مفادات کا مورچہ نہیں بننے دینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ

☆......☆......☆

سوزِ دل

دعا۔۔۔!

مولانا ابن الحسن عباسیؒ

دعا مومن کا ہتھیار، عبادت و بندگی کا نچوڑ، دل دردمند کا درماں اور قلب مضطرب کا سہارا ہے جب سارے ظاہری سہارے جواب دے جائیں، توقعات کے روزن اور امیدوں کے دریچے بند ہو جائیں ......تمنا کی ہری شاخ، حسرتوں کے بے رنگ کانٹے کا روپ دھار لے، ہر سمت اندھیرا چھا جائے......مایوسی کے اس عالم میں بندہ مومن کے پاس ایک دعا ہی کی قندیل رہ جاتی ہے، وہ ہاتھ اٹھاتا ہے، رب کی بارگاہ میں جاتا ہے، لجاجت کے ساتھ گڑگڑاتا ہے......فلک سے رحم لانے اور بخشش پانے کے لیے اس کے والہانہ نالے اٹھتے، اس کی آہیں بلند ہوتی، اس کی اشکیں رواں ہوتی اور اس کی فریادی نوائیں نکلتی ہیں، اس کے من میں اپنے کرتوتوں، شیطان کے چرکوں، نفس کے زخموں کی کسک کا احساس تازہ ہو جاتا ہے......اس کے دل میں جھوٹے خداؤں سے توقعات کی حماقتوں، زمانے کی بے وفائیوں، راستہ کی صعوبتوں، منزل کی دشواریوں اور زندگی کی شکایتوں کا درد جاگ اٹھتا ہے......جذبات کے تلاطم میں اس کی لڑکھڑاتی زبان "ربی ربی" (میرے رب، میرے اللہ) سے آگے بڑھنے نہیں پاتی......احساسات کا ریلہ لفظوں کی شکل اختیار کرنے کے بجائے ہچکیوں کا رخ کر لیتا ہے اور سرکشی کی منہ زور موجیں، شکستگی کے ساحل سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں، وہ ڈرتا بھی ہے اور مانگتا بھی ہے، کپکپاتا بھی ہے اور پکارتا بھی ہے، اسے خوف بھی رہتا ہے اور امید بھی کہ خوف و رجا اور امید و بیم کی یہ کیفیت ایمان کی نشانی ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ اس در کا بھکاری بننے میں قسمت کی سکندری اور بے نوائی کی یاوری ہے۔ شکستگی کی یہی ادا بندگی کی معراج، بندہ و خالق کے درمیان عجز و نیاز اور

نصرت خداوندی وصول کرنے کا موثر ذریعہ ہے، حدیث قدسی ہے، اللہ کہتا ہے: ”میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوں“......دل ٹوٹتا ہے، آرزو شکست کھاتی ہے اور تمناؤں کا آئینہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتا ہے تو عجز و بندگی کا جوہر چمکنے لگتا ہے:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
گر شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

ویسے تو ہر شخص اپنی زبان میں اپنی فہم اور اپنی ضرورت کے مطابق اللہ کی ذات سے دعائیں کرتا ہے لیکن احادیث کے مبارک ذخیرے میں جو دعائیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، ان کی فصاحت و بلاغت، ان کی سلاست و روانی، ان کی جامعیت و شیرنی اور ان کی برجستگی و بے ساختگی کو دیکھ کر بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے علاوہ اس قدر خوب صورت کلام کی کوئی اور نظیر نہیں، دنیا کی کوئی خیر و بھلائی ایسی نہیں جو ان میں مانگی نہ گئی ہو، کوئی ایسا شر نہیں جس سے پناہ طلب نہ کی گئی ہو......ان دعاؤں میں ہر ضرورت اور ہر بھلائی کا احاطہ کیا گیا ہے، ہر طرح کی پریشانی سے نجات کے لیے وظیفہ سکھایا گیا ہے، ہر مقام کی مناسبت سے ذکر کی تلقین کی گئی ہے، یہ اس قدر مؤثر اور بابرکت دعائیں ہیں کہ اگر آدمی ان کا اہتمام کرے تو اس کے شب و روز کی ساعتیں اللہ کے ذکر و مناجات سے معطر معطر ہوجائیں گی۔

مسلمان زخمی اور عالم اسلام کے چپے چپے پر ظلم و جبر کی داستانیں بکھری پڑی ہیں، دشمن تو کئی خطوں پر حملہ آور ہے ہی، جہاں نہیں، وہاں قدم قدم پر منافقین کا جال بچھا ہوا ہے، اس لیے یہ وقت، وقتِ دعا ہے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری طلب کرنے کے لیے اس سے زیادہ قبولیت کی گھڑیاں اور کیا ہوسکتی ہیں......بے شک رب کی شفقت کسی کو مایوس اور اس کی رحمت کسی کو محروم نہیں چھوڑتی، بس اس کے حضور ایک بار ہاتھ پھیلانا آجائے اور اس سے ایک بار مانگنا آجائے کہ:

دردہا دادی و درمانی ہنوز (تونے درد دیا ہے تو اب دوا بھی دیدے)

(انتخاب از قلم نما)

☆......☆......☆

تعلیم وتربیت

جنت کا شوق، ہماری ضرورت

مولانا بدرالحسن قاسمی

[مولانا بدرالحسن قاسمی صاحب (پ: ۱۹۵۵ء) ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۲ء دارالعلوم دیوبند کے مدرس اور دارالعلوم کے عربی مجلہ "الداعی" کے مدیر رہے، بعدازاں آپ کویت منتقل ہوگئے، جہاں تاحال آپ علمی خدمات میں مشغول ہیں، آپ اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے نائب صدر اور المعہد العالی للقضاء والافتاء، پٹنہ کے صدر ہیں۔ آپ صاحبِ طرز ادیب، محبوب قلمکار اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کے اردو وعربی، سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں، مضامین کے کئی مجموعے زیرِ ترتیب ہیں، آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاءاللہ۔ ادارہ]

دنیا کی زندگی میں اکثر آدمی اپنی منزل کو فراموش کر دیتا ہے اور ان چیزوں میں لگ جاتا ہے جو اسے منزل مقصود سے دور کر دیتی ہیں...... انسان با اختیار مخلوق ہے، زندگی میں اتنا اختیار وہ ضرور استعمال کرتا ہے جس پر اس سے باز پرس ہو سکے...... اعمال کا اسے ذمہ دار قرار دیا جائے......اور جن اصولوں پر وہ دوسروں سے معاملہ کرتا ہے، کورٹ اور کچہری کا رخ کرتا ہے، زیادتی کی صورت میں دوسرے کے خلاف ظلم کے دعوے کرتا ہے، انہیں اصولوں پر وہ خود بھی اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہے اور اس نے اگر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس کو بھی باز پرس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ البتہ اللہ کی ذات غفور اور رحیم ہے، وہ بہت سی غلطیوں کو معاف کرتا رہتا ہے لیکن جب بندہ سرکشی پر آجائے تو وہ سختی سے باز پرس بھی کرتا ہے۔

اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے جنت بنائی ہے، جنت میں ہر طرح کی نعمتیں ہیں، ایسی نعمتیں جن کو نہ تو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ ایسی نعمتوں کا خیال ہی کسی انسان کے دل پر گزرا:

(فیھا مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر)

اس جنت میں جانے کا شوق فطری ہے کہ وہی ہمارا اصلی وطن ہے۔ جن کو جنت کی طلب ہو، ان کی رات کی نیند حرام ہونے لگتی ہے:

(تتجافی جنوبھم عن المضاجع)

بعض خادموں سے جب ان کے آقاؤں نے باز پرس کی کہ تم رات کو نہیں سوتے، اس کا اثر تمہاری ڈیوٹی پر پڑتا ہے تو ان کا کہنا تھا کہ ہماری مجبوری یہ ہے کہ جنت کا شوق بڑھتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب دوزخ کا خوف بڑھ جاتا ہے تب بھی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے:

طال شوقی الی الجنة فطار نومی　　وزاد خوفی من النار ففارقنی النوم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنبیہ فرمائی ہے کہ زندگی میں دو بڑی چیزوں کو ہرگز فراموش نہ کرنا: ایک اللہ تعالیٰ سے جنت کی طلب ہے، دوسرے دوزخ سے اللہ کی پناہ مانگنی ہے۔

گھر کا جو فرد اپنی دنیوی زندگی پوری کر کے اس دنیا سے چلا جائے، اس کے لیے جو سب سے بڑی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ربِ کائنات اسے جنت میں جگہ دے اور اپنی رضا سے نوازے، برزخ کی زندگی طویل ہے، اللہ تعالیٰ اس میں قبر کو جنت کی کیاریوں میں ایک کیاری بنا دے تاکہ برزخ کی زندگی آئندہ جنت کی زندگی کی تمہید محسوس ہونے لگے۔

دنیا میں انسان نے جو اچھے عمل کیے ہیں، وہی اس کے ساتھ جاتے ہیں لیکن اصل چیز اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ

اس لیے اللہ کی بے پایاں رحمت سے امید رکھنی چاہیے۔

صالح اولاد کی دعا اور صدقہ جاریہ بھی آخرت میں نفع بخش ہے، زندگی میں انسان کو صدقہ جاریہ کا اہتمام کرنا چاہیے اور اولاد کو بھی چاہیے کہ ماں باپ کو ان کے مرنے کے بعد فراموش نہ کریں، ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی اور جنت کے لیے دعا کریں۔ بعض علماء کا معمول رہا ہے کہ وہ ساری زندگی صلاۃ اوابین میں قرآن کریم روزانہ ایک پارہ قرآن پڑھ کر والد کے لیے ایصال ثواب کا اہتمام کرتے تھے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول ہمیشہ رہا ہے۔

جنت قرآن وسنت پر عمل کرنے سے ملتی ہے، جنت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ملتی ہے، جنت اللہ رب العزت کے فضل وکرم اور لطف ورحمت سے ملتی ہے۔

ایک صحابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: **متی الساعۃ؟** قیامت کب آئے گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: **ماذا اعددت لھا؟** (تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟) انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیاری تو کچھ نہیں ہے البتہ مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

المرء مع من احب (آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے)

اس بشارت سے صحابہ کرام کو بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارا حشر ان کے ساتھ ہوگا، جن سے ہمیں محبت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت حضور کی اتباع میں ہے، ہر طرح کی سعادت آپ پر شب وروز درود بھیجنے میں ہے اور جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرب اچھے اخلاق والوں کے لیے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنت میں مرافقت کثرت کے ساتھ رب کائنات کے سامنے سربسجود رہنے میں ہے۔

گلہائے رنگا رنگ

حکمت و دانش کے کچھ ہیرے موتی

ڈاکٹر تحسین فراقی

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں اردو کے نثر نگاروں کی چاندی ایسی چمکتی کہکشاں میں آپ کوئی جادو اثر نثر نگار ملیں گے۔ انھیں میں ایک بے مثال نثر نگار خواجہ حسن نظامی بھی تھے۔ زندہ، توانا، شگفتہ اور سادہ نثر لکھنے والے۔ قدرتِ کلام ایسی کہ ہنسانے، رلانے دونو پر یکساں قادر۔ دلّی والے گویا دلّی کے روڑے۔ کتابوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ان سے یادگار ہے۔ انھی میں ان کی ایک مختصر خود نوشت بھی ہے۔ "آپ بیتی حسن نظامی" کے زیرِ عنوان لکھی جانے والی یہ آپ بیتی اپنی کئی خصوصیات اور خوبیوں کے باعث ناقابل فراموش کہی جا سکتی ہے اور میری پسندیدہ کتابوں میں شامل ہے۔ یہ آج سے ایک سو دو برس پہلے لکھی گئی یعنی ۱۹۱۹ء میں جب حسن نظامی عمر کے اکتالیسویں برس میں تھے۔ نظامی اس کی تالیف کے چھتیس برس بعد تک جیے۔ انیس سو چپن میں انتقال کیا مگر غالباً اسے مکمل نہ کر سکے۔ ہاں جتنا حصہ لکھ گئے، یادگار ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ آپ بیتی، ادب کی اصناف میں جتنی قابلِ مطالعہ اور دلچسپ ہوتی ہے، اتنی ہی مشکل بھی ہوتی ہے کیونکہ اپنے بارے میں بے کم و کاست لکھنا اور سچ بولنا دنیا کے سب سے مشکل کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑا حوصلہ اور جگر چاہیے۔ حسن نظامی ایک ایسے ہی صاحبِ حوصلہ اور جگر دار بزرگ تھے، اپنے بارے میں ملامت کا خوف کھائے بغیر بے تکلف بہت سی باتیں لکھ گئے ہیں۔ کتاب میں حکمت کے کئی روشن موتی اور دانش کے کئی چمکتے ہیرے ہیں۔

حسن نظامی تین بزرگوں سے بیعت ہوئے۔ اولاً گیارہ برس کی عمر میں شاہ اللہ بخش تونسویؒ سے، پھر سولہ برس کی عمر میں خواجہ غلام فریدؒ سے اور آخر میں پیر سید مہر علی شاہؒ گولڑہ شریف سے چوبیس برس کی عمر میں۔ پہلی دو بیعتیں والد اور بھائی کے ایما پر ہوئیں اور آخری خود ان کی اپنی مرضی سے۔ حسن نظامی پیر سید مہر علی شاہؒ سے صاحبِ اجازت تھے۔ نظامی صاحب سے ہزاروں لوگ بیعت ہوئے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ سید بدر الدین اسحٰق بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے داماد تھے۔ یہ وہی بدر الدین اسحٰق ہیں جنھوں نے نظام الدین اولیاؒ کی روحانی تعلیم و تربیت میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۹۰۸ء میں جب حسن نظامی نے اپنے بعض مخلص احباب کے تعاون سے حلقۂ نظام المشائخ قائم کیا اور ان کے مریدین کی تعداد تیزی سے بڑھی تو درگاہِ نظام الدین اولیاء کی برادری نے ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ ان کی شدید کردار کشی کی گئی۔ پولیس میں رپورٹ کی گئی کہ حسن نظامی درگاہ میں فساد کرنے والے ہیں۔ انھی ایام میں ایک المیہ یہ ہوا کہ ان کی محبوب بیوی حبیب بانو فوت ہو گئیں۔ کچھ عرصے بعد ان کے دولڑکے راہی ملکِ بقا ہوئے۔ ان تمام دردناک مصائب میں بھی صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا اور بالآخر ان کے حریف خائب و خاسر اور ذلیل و خوار ہوئے۔ سچ ہے کہ جھوٹوں اور افتراء پردازوں کا انجام تو نوشتۂ دیوار ہوتا ہے۔ کاش وہ اسے پڑھ سکیں۔ حسن نظامی نے حضرتِ محبوب الٰہی کا ایک بے مثل قول نقل کیا ہے: ”کشندہ کشندہ بود“ یعنی جو برداشت کر لیتا ہے، وہ مار ڈالتا ہے!

نظامی صاحب نے اس آپ بیتی میں اپنے مزاج اور شخصیت کے بارے میں بہت سی باتیں نہایت بے تکلفی سے لکھ ڈالی ہیں جن کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ چند اعترافات آپ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

۱.......: ”میں پسند نہیں کرتا کہ جو لفظ میرے اعزاز کا اخبار و رسالے میں لکھا جائے، اس میں کوئی اور بھی شریک ہو۔ واحدی صاحب مجھ کو ”حضرت“ لکھتے ہیں اور جب کبھی کسی اور کو وہ ”حضرت“ لکھ دیں تو مجھ کو ناگوار ہوتا ہے۔

۲......: "اب مجھ کو اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ خوشامد اور واقعی تعریف کو سمجھ لیتا ہوں مگر پھر بھی کیریکٹر کی کمزوری سے خوشامد میرا دل خوش کر لیتی ہے...... میرے دل میں خوشامدی پر مہربانی پیدا ہوتی ہے"۔

۳......: راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ مشہور ہے۔ میں نہ راجا ہوں، نہ بچہ ہوں، نہ عورت ہوں مگر میرے اندر ضد اور ہٹ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ باوجود رائے کی بے استقلالی کے ضد کا یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اس پر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو اس سے دست بردار نہیں ہوتا"۔

۴......: "خود مجھ کو کوئی حادثہ پیش آ جائے یا قریبی دوست و مرید کو، میں اس کے اصلی صدمہ کو بہت کم محسوس کرتا ہوں اور غم سے مجھے رونا نہیں آتا۔ صرف محبت کے قصے یا واقعے سے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ لکھا تھا غم کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ میرے دل کی سچّی تصویر تھی۔ میری بیوی مر گئی، دو لڑکے مر گئے۔ لڑکی مر گئی مگر میرے دل پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔" حسن نظامی نے اپنے اس بے لچک اور رقت سے عاری مزاج کو "سنگدلی" سے تعبیر کیا ہے۔

حسن نظامی نے اپنی آپ بیتی میں بعض بڑی عمدہ اور حکیمانہ باتیں لکھی ہیں جو فکر کو مہمیز کرتی ہیں اور سوچ کا رخ متعین کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ دراصل ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق تھا۔ لڑکپن اور جوانی کی غربت، شبانہ روز مجاہدوں، وسیع اسفار اور "چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا" کے اسلوبِ زیست نے ان میں غیر معمولی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ انھوں نے بعض ایسی عمدہ باتیں اپنی اس کتاب میں لکھ دی ہیں جو دیر تک ہمارے حافظے کا ساتھ دے سکتی ہیں، ایسی باتیں جن میں بصیرت اور سچائی کی پائندہ روشنی ہے، حکمت خالدہ ہے:

(ا)......دل کا ٹوٹ جانا، سہاروں کا ہاتھ سے چھوٹ جانا، انسان کے لیے ایک نعمت ہے۔

(ب)......جو شخص خوشی میں نہ اترائے اور غم میں نہ گھبرائے اس کی زندگی اس دنیا میں بہشت کی زندگی ہے۔

(ج)......صوفیوں نے کہا ہے تعلقات کا کم کرنا تصوف ہے۔ میں کہتا تھا تعلقات ہی کا نام

زندگی ہے۔اب کہتا ہوں صوفی سچے ہیں۔تعلقات کی کمی تصوف ہی نہیں بلکہ بڑی آسائش کی زندگی ہے۔جس کے تعلقات کم ہیں،اس کی تکلیفیں اور ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

(د)......مردہ اچھا زندہ ہے کہ تعلقات نہیں رکھتا اور زندہ بُرا مردہ ہے کہ تعلقات کی سکرات میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے۔

(ہ)......فقیر کے دروازے پر جانے والا امیر بہت اچھا ہے اور امیر کے دروازے پر جانے والا فقیر بہت بُرا۔

(و)......سفارش اہلِ مشرق خصوصاً مسلمانوں کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔دیسی ریاستوں میں "سازش اور سفارش" کے دو سین اور شین رات دن کام کرتے ہیں۔

(ز)......جن لوگوں کو اپنے بیوی بچوں کا فکر ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، وہ خدا کے انتظام کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

(ح)......میری ہر تحریر میرا جھوٹا کھانا ہے کہ اس کو لکھ کر اصلی ذائقہ میں چکھ لیتا ہوں اور جھوٹا دوسروں کے حصے میں آتا ہے۔دنیا میں ہر مصنف کا یہی حال ہے کہ لطف تو وہ خود اٹھاتا ہے اور بچی کھچی تلچھٹ دوسروں کو تقسیم کرتا ہے۔

(ط)......خیال کیا کر کہ جب تیری روح کے حواس اپنی ہستی پر غور کرتے ہیں تو تجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ تیرے جسم وجان کے علاوہ کوئی تیسری چیز جو تیرے جسم وجان کے مجموعے پر غور کر رہی ہے، موجود ہے مگر پھر بھی تجھ کو یاد نہیں رہتا اور اُسی زندہ گوشت پوست کو حسن نظامی سمجھنے لگتا ہے۔

حسن نظامی کی آپ بیتی معقول سے اوپر اٹھنے اور آگے بڑھنے کی تحریک دیتی ہے۔انھوں نے اپنی تحریر کو اپنا جھوٹا کھانا لکھا ہے۔مجھے اور آپ کو شاید ہی اس سے اتفاق ہو۔سچ یہ ہے کہ دانش اور حکمت کے موتیوں سے گندھی تحریر اپنے خالق ہی کو نہیں اپنے قاری کو بھی حظ اندوز کرتی ہے اور یہ عمل رکتا نہیں۔کسی عرب شاعر نے کس قدر سچا شعر کہا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ تحریر کاغذ پر دیر تک چمکتی رہتی ہے۔درآں حالیکہ اس کا لکھنے والا مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

میرا مطالعہ

میری علمی ومطالعاتی زندگی

مفتی امداد اللہ انور(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائی زانوئے تلمذ: فارسی کتب اور صرف ونحو کی بہت سی معروف وغیر معروف کتابیں حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تلمیذ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ اور اپنے چچا حافظ کتب فارسی عبدالحئی المعروف حضرت مولانا حضور بخش رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھیں۔

بعض وجوہ سے مجھے غیر مقلد کے ایک مشہور ''مدرسہ دارالحدیث محمدیہ'' جلال پور پیروالہ والا میں تعلیم کے لیے داخلہ لینا پڑا، وہاں پر ایک سال پڑھتا رہا، چونکہ غیر مقلدین حضرات کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر کسی کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتے ہیں، تو یہی رویہ میرے ساتھ بھی اپنایا، ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح سے وہ مجھے غیر مقلد بنالیں، اس لیے وہ ہر آئے دن میرے ساتھ اختلافی مسائل پر مباحثہ کرتے تھے، میں نے اس شہر کے ''مدرسہ عربیہ رحمانیہ'' سے رجوع کیا، تو ان سے مجھے محقق العصر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی کتاب ''احسن الکلام فی ترک

---

(۱) سنِ پیدائش: ۱۹۶۰ء، آبائی وطن: بستی عنایت پور تحصیل جلال پور پیروالا، ضلع ملتان، مادر علمی: مدرسہ اشرف العلوم شجاع آباد، جامعہ قاسم العلوم، ملتان، سنِ فراغت: ۱۹۸۶ء، تدریسی خدمات: جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ لاہور و جامعہ قاسم العلوم، ملتان، تصانیف: آپ بیسیوں کتابوں کے مصنف اور ان سے زائد اہم علمی وتحقیقی عربی کتابوں کے مترجم ہیں، مناصب: سابق معین التحقیق حضرت مولانا جمیل احمد تھانویؒ، مؤسس دارالمعارف، ملتان، مہتمم مدرسۃ الصالحات القریش کالونی، ملتان، خلیفہ مجاز: حضرت مولانا سید نفیس الحسینی قدس سرہ

القراءۃ خلف الامام‘‘ دستیاب ہوگئی، چنانچہ میں نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا، اس کے دلائل یاد کئے اور مخالفین کا رد بھی، اس کتاب کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں دلائل کو نہایت عمدگی سے ذکر کیا گیا تھا، دلیل کا حوالہ اور مجموعہ کتب کا تعارف اور جرح تعدیل اور اس کے ائمہ کا تذکرہ اور تعارف، رواۃ حدیث کا تعارف محدثین کا تعارف، غرض یہ کہ اس میں کوئی چیز تشنہ نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ایک مبتدی کے لیے بھی وہ کتاب کامل تھی اور اس کے مندرجات کا پورا تعارف ہو تو منتہی کے لیے بھی وہ ایک علمی تحقیق یادگار تھی۔

ان دو چیزوں (غیر مقلدین کے مباحثہ اور اس کتاب) نے میرے ذہن کو تحقیق کے میدان کی طرف مائل کر دیا، پھر دورہ حدیث تک اپنے مدارس میں مَیں نے جتنی کتابیں پڑھیں، اسی مزاج سے ہر کتاب کو باقاعدہ توجہ سے پڑھا۔ استاد کی تقریر کی کتاب عبارت پر تطبیق دیتا، اور ہر سبق میں حاضری کا باقاعدہ اہتمام کرتا تھا، اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ عربی زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی، اور دوسری غیر درسی کتابوں کے سمجھنے کا ملکہ بھی حاصل ہوگیا، تصنیف وتالیف کا جتنا بھی کام اللہ تعالیٰ نے اس ناچیز سے لیا ہے، تقریباً اسی طریقہ کی برکت سے ہے اور توفیق خداوندی کو اس میں اولین حیثیت حاصل رہی ہے۔

ھدایہ اول والے سال مناظرہ میں فتح: جامعہ قاسم العلوم ملتان میں جب میں نے ’’ھدایہ اولین‘‘ کے سال میں داخلہ لیا، تو اس سال اس مدرسہ میں دورہ حدیث کا ایک طالب علم محمد نذیر تھا، اس نے مجھے مناظرہ کا چیلنج دے دیا کہ میرے ساتھ غیر مقلدین کے جس مسئلہ پر چاہو مناظرہ کرلو، اس نے غیر مقلدین کے مدرسہ جا کر **فاتحہ خلف الامام** کے موضوع پر تیاری بھی کی، مگر مجھ سے مناظرہ میں شکست کھا گیا۔

ردفرق باطلہ میں مناظر اساتذہ کرام: تعلیمی سالوں میں ماہ شعبان و رمضان کی تعطیلات کو میں فارغ رہنے کی بجائے کسی نا کسی کورس میں مصروف رہتا تھا، چنانچہ میں نے شیخ المشائخ مولانا عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالحیٔ خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث

مولانا زکریا رحمہا اللہ تعالیٰ سے دو مرتبہ اور ایک مرتبہ امام اہل سنت والجماعت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ سے دورہ تفسیر میں شرکت کی، اس طرح سے شیعیت کے رد میں حضرت علامہ عبدالستار تونسوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور مولانا امین اوکاڑوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور ردعیسائیت جناب عبدالرحیم منہاج رحمہ اللہ تعالیٰ (سابق پادری) سے اور مولانا بشیر احمد حسینی شورکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ سے، اور رد قادیانیت اپنے چچا حضرت مولانا عبدالرحیم اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ (سابق مرکزی رہنما، امیر ثالث وناظم تبلیغ مجلس تحفظ ختم نبوت) سے پڑھی، اور بطور تخصیص مختلف مسائل اور فرق کے متعلق حضرت علامہ مفکر اسلام ڈاکٹر خالد محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک عرصہ دراز تک صحبت رہی اور علمی اسفار میں شرکت رہی، مناظرے اور تحقیق کے طریقے سیکھے اور اپنی طرف سے ان مذاہب اور فرقوں کی کتابوں کا مطالعہ بدستور جاری رہتا، ہندومت کے مطالعہ کے لیے معروف کتاب ''تحفۃ الہند'' کا مطالعہ کیا تھا۔

داعیانِ اسلام کے لیے ایک عظیم خدمت: کسی زمانہ میں مجھے عیسائیوں کی بائبل اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''اظہار الحق'' کا ترجمہ "بائبل سے قرآن تک" ازبر تھیں، اسی طرح تقریباً ہر فرقہ کی اور اس کے رد کی کتابیں میں نے جمع کیں، میرے والدِ گرامی قدر حضرت مولانا عزیز اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق بھی ایسا ہی تھا، انہوں نے بھی ان موضوعات پر بہت سی کتابیں جمع کیں تھیں، چنانچہ مدرس حرم مکی جناب حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم العالیہ نے مجھ سے اسلام پر کفار کے اعتراضات اور ان کے جوابات پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی تو میری ذاتی لائبریری میں اس کے متعلق پہلے ہی اتنا مواد موجود تھا کہ الحمد اللہ مجھے کسی جگہ لائبریری میں جانے کی یا مزید کوئی کتاب خریدنے کی حاجت پیش نہیں آئی۔ یہ کتاب ۴۰۰ سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ایک ہزار سے زائد صفحات میں چھپ چکی ہے۔

دورہ حدیث سے فراغت کے بعد اسی ذوق کی بنیاد پر میں نے امام صیمری رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۴۳۶ھ کی کتاب ''أخبار أبی حنیفة و أصحابه'' عربی کو طبع کیا، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری

کے متعلق جو خود غیر مقلدین نے کفر کے فتوے ''فیصلہ مکہ'' نامی کتاب میں چھپوائے تھے، وہ بھی طبع کی تھی۔ میں نے مناظروں کے کورسز میں اپنے اکابر سے خالص مسلک ومشرب دیوبندیت کا ذوق پایا ہے، اس لیے میں اختلافی مسائل میں مذاہب سے کام نہیں لیتا۔

عربی، فارسی اور اردو ہزاروں کتابوں کی ورق گردانی سے میں نے جو مسلک اختیار کیا ہے، وہ یہی ہے کہ مذاہب اہل سنت والجماعت حنفی دیوبندی بالکل حق ہے، باقی جتنے فرقے یا جماعتیں موجود ہیں وہ ناحق ہیں یا غلطی پر ہیں۔ اور ان کتابوں سے مطالعہ سے اپنے اکابر پر مکمل اعتماد اور اعتقاد حاصل ہوا، اور پوری بصیرت سے حاصل ہوا، اسی ضمن میں عرصہ تیس سال قبل غیر مقلدین، بریلوی، شیعوں، ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرے اور مباحثے بھی ہوتے رہے، اور الحمد اللہ! اللہ تعالیٰ فتح وکامرانی عطا کرتے تھے، **الحق يعلو و لا يعلى عليه**۔ اسی مزاج کی وجہ سے بندہ نے مستند نماز حنفی کی تالیف وتصنیف کی تھی جو اہل علم وتحقیق سے داد وتائید حاصل کر چکی ہے۔

''أحكام القرآن للتهانوي'' منزل چہارم کی تالیف: جب میں نے فراغت کے بعد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی قدس سرہ العزیز (صدر مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور) کے پاس چھ سال رہ کر ''أحكام القرآن للتهانوي'' (یعنی دلائل القرآن علی مسائل النعمان) کی تالیف وتصنیف کی تھی تو اس میں بھی یہی ذوق کارفرما تھا۔

چونکہ یہ کتاب **اعلاء السنن** کے طرز پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اکابر علماء کرام (۱) حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ (۲) حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ (۳) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ (۴) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سپرد تصنیف کی تھی، اور اس میں مسائل احناف کو قرآنی آیات سے مبرہن ومدلل کرنا تھا، اور ائمہ ثلاثہ رحمہ اللہ کے مستدلات کا جواب لکھا تھا، اور چوتھی منزل حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی نور اللہ مرقدہ کے ذمہ لگائی تھی، جبکہ وہ پیرانہ سالی اور سماعت وبصارت کی کمزوری کی وجہ سے مآخذ کی ورق گردانی نہیں کر سکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس ناچیز کو اس کتاب کی

خدمت میں شامل کردیا، چنانچہ یہ چوتھی منزل کا حصہ تین ضخیم جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔

عربی اردو و فارسی کتب کے تعارف کی داستان: اس تفسیر کی تالیف کے لیے حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا عظیم کتب خانہ ''دارالعلوم الاسلامیہ'' کامران بلاک لاہور کے لیے وقف کردیا تھا، اوراس دینی ادارہ کا نام ''ادارہ اشرف التحقیق والتصنیف'' رکھا گیا تو اس کتب خانہ میں موجود بہت ساری دینی کتب کا مطالعہ کا بہترین موقع مل گیا، جس میں ہر علم وفن کی کتابیں موجود تھیں لیکن طبیعت کو اس سے سیری حاصل نہ ہوئی، لاہور چونکہ بڑے بڑے کتب خانوں کا مرکز ہے، میں شام کو ان کتب خانوں میں اور پبلک لائبریریوں میں اور علماء کی ذاتی لائبریریوں میں مدارس کی لائبریریوں میں چلا جاتا تھا اور علمی پیاس بجھاتا تھا۔

اس طرح سے مجھے کتابوں کے نام، ان کے مصنّفین ومؤلفین پر کافی دسترس ہوگئی، بلکہ حرمین شریفین (**زادھما اللّٰہ شرفاً و کرماً**) کا تقریبا پچیس مرتبہ سفر ہو چکا ہے، اور الحمد اللہ مسجد نبوی کی عظیم لائبریری اور حرم مکہ کی باب فہد سے اوپر والی لائبریری میں بہت وقت گزرتا ہے، بلکہ ان کتابوں سے استفادہ کے ساتھ ساتھ وہاں بھی تصنیف اور ترجمہ کا کام جاری رہتا ہے۔

پسندیدہ کتب: مجھے اکابر کی سبھی کتابیں پسند ہیں، ہر کتاب کو میں اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرتا ہوں، فقہ حنفی اور فقہاء احناف کے تذکرہ کی کتابوں سے بہت زیادہ دلچسپی ہے، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعد کے مجاہدین کے کارناموں کو کافی شوق سے پڑھا ہے، تصوف اور اولیاء کرام کے احوال وکرامات سے روح کو تسلی ملتی ہے۔

افسانے، ناول، مزاح، اور طنز کی کتابیں تو مجھے بالکل پسند نہیں ہیں، یہ زیادہ تر جھوٹ اور بناوٹ پر مبنی ہوتی ہیں جس کا طبیعت پر غلط اثر پڑتا ہے، بلکہ ایک عرصہ سے تو میں نے گمراہ فرقوں کی اور گمراہ لوگوں کی کتابیں پڑھنا چھوڑ دی ہیں، اس طرح ان کے منحوس اثرات سے بچا جا سکتا ہے۔

مزاج تالیف وتصنیف: میں نے اپنے قلم کا زیادہ تو مزاج مثبت رکھا ہے جس کی وجہ سے الحمد اللہ

میری کتابیں ہر فرقہ کا تقریباً ہر شخص پڑھ لیتا ہے، میں نے مسلمانوں کے اخلاق واعمال کے سنوارنے والے عنوانات کو زیادہ تر موضوع سخن بنایا ہے اور الحمد اللہ تقریباً سو کے قریب ایسے عنوانات پر خدمت کا موقع مل چکا ہے۔

میں اپنی مطالعاتی زندگی میں سب سے زیادہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۹۱۱ھ سے متاثر ہوں اور میری اکثر کتابوں میں بھی عمومی انہی کا مزاج کارفرما ہے۔

اپنی کتابوں میں بس ہمیشہ اکابر کی آراء اور تحقیقات ہی کو تحریر کرتا ہوں، نہ اپنی طرف سے کچھ حاشیہ آرائی کرتا ہوں، نہ اضافہ تاکہ جو کچھ لکھا جائے سب انہیں کا ہو، اسی لیے ہر بات کا حوالہ لکھتا ہوں، مجھے یوں بھی ڈر لگتا ہے کہ کوئی بات میں اپنی طرف سے تحریر کردوں، وہ غلط تحریر ہو جائے تو اس کی میری طرف نسبت نہ ہو جائے تو نقل میں احتیاط کرتا ہوں تاکہ قارئین اطمینان سے اس پر عمل کرسکیں۔ بہت سے مؤلفین اور مصنّفین بعض مسائل میں اپنا اپنا تفرد لکھتے ہیں، تصنیف کے میدان میں اس کا تنقیص بہت ضروری ہوتا ہے، ایسی کوئی شے کتاب میں نہ آجائے جس سے قارئین میں فرقہ بندی شروع ہو جائے۔

الحمد اللہ! یہ اسلوب اتنا مقبول ہوا ہے کہ حضرت استاذ یم امام اہل السنۃ والجماعۃ مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی آخر عمر میں بعض بیٹوں سے میری کتابیں ان کے حواشی میں موجود حوالہ جات سمیت پڑھواتے اور سنتے تھے۔

میں نے لکھنے میں ہمیشہ یہ طرز اپنایا کہ جس موضوع پر اردو زبان میں کام نہ ہوا ہو یا تو اس پر مستقل کوئی کتاب تصنیف کردی جائے یا پھر کسی اہم عربی کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کردیا جائے، ترجمہ عام فہم اور سادہ رکھنے کی فکر ہوتی ہے تاکہ ہر معمولی پڑھا لکھا شخص بھی پڑھ سکے اور سمجھ سکے، مگر وہ کتاب اپنے علمی معیار اور مضامین کی وجہ سے اہل علم کی توجہ کا بھی بخوبی محور بن جاتی ہے، چنانچہ ان کتابوں کو مختلف ملکوں اور زبانوں کے علماء نے اپنے علاقوں اور زبانوں میں تراجم کئے ہیں، اور بلا مبالغہ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہیں، ان کتابوں اور ان کے تراجم کو pdf میں پڑھنے

والوں کی تعداد کا تو کوئی شمار نہیں ہے۔

ترجمہ قرآن پاک: قرآن کریم کا ترجمہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اپنے اندر ایک خاص صفت ایسی رکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی تلاوت کرتے ہوئے چند پارے پڑھ لے تو اس کا دل پاک ہوجاتا ہے اور ترجمہ کا اس پر اثر ظاہر ہوجاتا ہے خصوصا پاک طبیعت لوگوں کے لیے تو روحانی ترقیات کا تیز ترین اثر رکھتا ہے۔

علم اصول حدیث کے موضوع پر ایک تحقیقی کاوش: جب میں نے علوم حدیث پر کتاب **''معجم علوم الحدیث النبوی''** کی تصنیف کی تھی تو اس پر کئی سال کی محنت صرف ہوئی، اس کی تصنیف میں تقریبا پندرہ سو کتابیں دیکھی گئیں مگر حوالے صرف چار سو کتابوں کے دیئے جاسکے، اس میں حدیث کے متعلق ۲۵۰۰ علوم و اصطلاحات کو درج کیا گیا ہے۔

انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تو اس پر برانگیختہ کرنے اور شوق دلانے کے لیے میں نے ایسے عنوانات کا انتخاب کیا تا کہ ان کی زندگی سنور جائے اور آخرت روشن ہوجائے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس فقیر کو توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس کے صدقہ میری دنیا و آخرت سنوار دے اور رضائے کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے: شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

یہ چند باتیں جناب محترم مولانا محمد بشارت نواز صاحب زید مجدہم کی فرمائش پر شکستہ قلم سے لکھ دی ہیں، اللہ کرے کہ قارئین کو ان سے کچھ فائدہ حاصل ہوجائے اور دین متین کی صحیح نہج پر خدمت سر انجام دے سکیں۔

امداد اللہ انور

۱۲ جمادی الاولی ۱۴۴۲ھ

۲۵ جنوری ۲۰۲۱ء

(عناوین کا اضافہ صاحبزادہ محمد سلمہٗ کی طرف سے ہے۔)

☆......☆......☆

سوزِ دل

علاج اس کا بھی اے چارہ گراں!

محمد بشارت نواز
نائب مدیر ماہنامہ النخیل

گزشتہ چند دہائیوں سے جس تیزی کے ساتھ علم و تحقیق کے میدان سنسان ہونے لگے ہیں، اسی قدر نوجوانوں کی اکثریت اخلاق باختہ اور بدتہذیبی کی عادی ہوکر آداب سے کوسوں دور ہو رہی ہے، ملتِ اسلامیہ کا جواں خون اہل علم کا بے ادب اور ان پر طعن و تشنیع کے لیے جری ہو رہا ہے، اس صورتِ حال نے مستقبل کے بارے میں فکر مند حضرات کو انتہائی تشویش میں مبتلا کر دیا ہے اور یہ تشویش ہے کہ روز بروز بڑھ ہی رہی ہے، اسلامی تعلیمات و مشرقی تہذیبی اقدار سے دوری کے دل دہلا دینے والے نقصانات کھلی آنکھوں نظر آنا شروع ہو گئے ہیں، اس کے اسباب پر غور کیا جائے تو ایک بڑا سبب نسلِ نو کا علم و کتاب سے دور ہونا ہے، علم و کتاب سے جتنا رشتہ کمزور ہو رہا ہے، اتنی علمی گراوٹ بڑھ رہی ہے، شعور کی پختگی ناپید ہو رہی ہے اور سطحیت کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔

نسلِ نو ملت کا مستقبل اور کل سرمایہ ہے، اس کا اس طرح ضائع ہونا انتہائی تشویش ناک بات ہے، نوجوانوں کو روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی موت سے بچانے کے لیے غذا کا انتظام کرنے کی کوشش ضروری ہے، مطالعہ اس غذا کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لہٰذا نسلِ نو کو علم و کتاب سے وابستہ کرنے کے لیے اپنے تئیں ہر ممکن کوشش ناگزیر ہے۔ اس کے لیے کئی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں، کئی مقامات پر اس حوالے سے کوششیں جاری ہیں اور محنت کرے والوں کو کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے، ان کوششوں کے بارے میں بات کرنے سے پہلے مختصراً مطالعہ کے رجحان میں کمی کے اسباب کا جائزہ

لیتے ہوئے اس رجحان میں کمی کے نقصانات کا ذکر کرتے ہیں:

مطالعہ کے رجحان میں کمی کے اسباب:

☆......کہا جاتا ہے کہ انٹرنیٹ، موبائل فون اور سوشل میڈیا کے فروغ نے کتاب بینی کے کلچر کی بیخ کنی کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اب لوگ موبائل فون پر مصروف رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے علاوہ کیبل کلچر نے بھی لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی ترجیحات بدل کر رکھ دی ہیں۔ شاید یہ مکمل سچ نہیں ہے۔ دورِ جدید میں امریکہ جدید ذرائع کو اپنانے اور فروغ دینے کے حوالے سے اقوامِ عالم میں سب سے آگے ہے، اسی طرح سب سے زیادہ انٹرنیٹ کا استعمال، ریڈیو اور ٹی وی چینلز کی دنیا میں سب سے زیادہ تعداد بھی امریکہ میں ہے لیکن سب سے زیادہ اخبارات و کتب بھی امریکہ میں ہی چھپتی ہیں، موبائل فون و سوشل میڈیا کے کثیر استعمال کے باوجود، امریکی سب سے زیادہ کتب بینی کرتے ہیں۔

☆......کہا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں کتب بینی کے خاتمے کا سبب کتابوں کی قیمت کی گرانی ہے، لوگ کتابوں کی خریداری پر کچھ خرچ کرنا پسند نہیں کرتے ہیں لیکن شاید یہ بھی پوری سچائی نہیں ہے، کیوں کہ وقت کے ساتھ یہ گرانی تو کپڑے، جوتے کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ غرض یہ کہ ہر شے میں ظاہر ہو رہی ہے، اس کے باوجود ان کی خریداری بدستور جاری ہے۔

☆......بعض لوگ اس کا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ آج کے اس مشینی دور میں انسانی زندگی کی رفتار بھی بے حد بڑھ گئی ہے، اس لیے مطالعہ کا وقت نکالنا مشکل ہو گیا ہے، شاید یہ بھی پورا سچ نہیں ہے کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں جس کوشش سے بہت ساری غیر ضروری سرگرمیوں کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، مطالعہ کے لیے وقت نکالنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔

کتاب بینی کے رجحان میں کمی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب مطالعہ کے ماحول (کلچر) کا خاتمہ اور ”مطالعہ“ کا ترجیحات کی فہرست سے خارج ہونا ہے، انسان سب سے زیادہ اثر اپنے ماحول سے لیتا ہے، خصوصاً بچپن کا ماحول ذہن پر نقش ہو جاتا ہے، یہی وہ عمر ہے جس میں ذہن کو مطالعہ کی طرف راغب کیا جانا چاہیے لیکن گزشتہ چند دہائیوں سے نئی نسل کو مطالعہ کا وہ ماحول نہیں مل رہا جس کی

اس وقت انہیں ضرورت ہے۔ دینی وعصری تعلیمی ادارے ایسی تربیت گاہ ہیں جہاں سے معاشرے کا ہر فرد تربیت پاتا ہے لیکن بہت کم تعلیمی ادارے ہیں جو طلبہ کو ابتدا ہی سے اس جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہورہے ہیں، اس کا نتیجہ ہے جو کھلی آنکھوں نظر آرہا ہے۔

مطالعہ کے رجحان میں کمی کے نقصانات:

☆......علم ایک روشنی ہے، یہ انسانیات کی معراج ہے جبکہ جہالت ایک تاریکی ہے جس میں انسان بھٹک کر پستی میں گرتا چلا جاتا ہے۔ آج جو ماحول میں ہر طرف منافرت، عدمِ برداشت اور کثافت ہے، اس کا سبب علم کی روشنی کا فقدان ہے، ہماری نئی نسل جو اپنے بڑوں کی بے ادب، ان پر طعنہ زن اور ان سے بداعتماد نظر آرہی ہے، یہ اسی روشنی کی کمی کا اثر ہے اور یہی اس رجحان میں کمی کا سب سے بڑا نقصان ہے۔

☆......آج جبکہ علم کے نام پر بڑے بڑے فتنے ظاہر ہورہے ہیں، ہمارے نوجوان بہت تیزی سے ان کا شکار ہورہے ہیں، اس کا بڑا سبب علم و کتاب سے دوری ہے جبکہ علم و کتاب سے وابستگی اپنے اکابر و اسلاف پر اعتماد کا ذریعہ ہے اور یہ اعتماد ہر قسم کی گمراہیوں سے بچنے کا ضامن ہے۔

☆......ہماری اولادیں ہمارے علمی ذخائر کی وارث ہیں، ان کا آج علم سے آشنا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ کل ہمارے یہ علمی ذخائر، یہ کتب خانے، یہ بھری پڑی لائبریریاں انہیں ردی نہ لگیں۔ ورنہ ہمارے جاتے ہی بیسیوں اہلِ علم کی لائبریریوں کی طرح ہماری لائبریری کی کتابیں بھی فٹ پاتھ کی زینت بن جائیں گی۔

مطالعہ کا ذوق پیدا ہونے کی سب سے بہترین عمر اور اہم وقت "بچپن" ہے، لہٰذا نسلِ نو کو شروع ہی سے کتاب سے وابستہ کرنا زیادہ نفع بخش ہے، بچپن سے ہی مطالعہ کا رجحان پیدا کرنے کے لیے چند تجاویز پیشِ خدمت ہیں:

☆......بچہ اپنی ابتدائی عمر کے اکثر اوقات چونکہ اپنے گھر میں گزارتا ہے، گھر کا ماحول ہی اس کے لیے سب سے پہلا نمونہ ہوتا ہے اور وہ شروع ہی سے اپنے خاندانی عادات و اطوار کو اپنانے لگتا

ہے، نہ صرف افرادِ خانہ کی گفتگو کے اس پر اثرات پڑتے ہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ان کے افعال و کردار اس پر اپنے نقش ثبت کر رہے ہوتے ہیں، بچہ وہی کام کرتا ہے جو اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اسی لیے حکیم و دانا لوگوں کا کہنا ہے کہ "آپ بچوں سے جو کام کرانا چاہتے ہیں، انہیں اس کی نصیحت کرنے کے بجائے وہ کام ان کے سامنے شروع کر دیں، بچے خود بخود اس کے عادی ہو جائیں گے۔" لہٰذا نسلِ نو کو علم و کتاب کی طرف لانے کے لیے ہمیں خود بھی علم و کتاب سے وابستہ ہونا پڑے گا۔ بچے تو بچے بڑے بھی صحبت کا کتنا اثر لیتے ہیں معروف ادیب احمد جاوید صاحب لکھتے ہیں:

> "مطالعے کا پروگرام مطالعے کرنے والوں کی صحبت سے بنتا ہے۔۔۔ میرا مشورہ ہر ایک سے یہی رہتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو، ان شاء اللہ مہینے بعد ہی تم خود کتابیں ڈھونڈتے نظر آؤ گے اور اپنی مصروفیات میں سے تردد کر کے وقت نکالو گے۔"

☆...... بچے کو تعلیمی سرگرمیوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی کتاب سے جوڑنے کی کوشش کی جائے، اسے کھیل کے لیے کھلونے پکڑانے کی بجائے (غیر اہم) کتابیں اگر ممکن ہو تو پھل پھول وغیرہ کی تصاویر پر مشتمل کتابیں دے کر انہیں الٹنے پلٹنے اور ان پر ہاتھ پھیرنے کا طریقہ سکھا دیا جائے۔

☆...... تعلیمی سرگرمیاں شروع ہو جانے کے بعد انہیں کتابوں میں مشغول رکھنے کی کوشش جائے۔ گھر میں ہمہ وقت تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں، یہ چھوٹے بڑوں، سب کے لیے نفع بخش ہے۔

☆...... بچے جب پڑھنے لکھنے لگیں، ان سے پڑھائی لکھائی سے متعلقہ سوالات کا سلسلہ شروع ہو جائے مثلاً بچوں کے ناموں کی ترکیب (جوڑ) کرائی جائے، ترکیب کا طریقہ بتایا جائے، ترکیب میں ان کا تعاون کیا جائے، گلی میں چلتے ہوئے دکانوں کے نام پڑھوائے جائیں، ناموں کے درست پڑھنے پر بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے، غلط پڑھنے پر ہمت بندھائی جائے۔ ان کے لیے نصابی کتابوں کے علاوہ آسان زبان میں لکھی گئی چھوٹی چھوٹی کہانیوں، نظموں وغیرہ کی (بچوں کے ادب پر مشتمل) کتابیں بھی مہیا کی جائیں لیکن ان کتابوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے، اس کے لیے

بچوں کے معیاری رسائل زیادہ مفید ثابت ہوں گے، جس سے بچوں کے اخلاق بھی سنوریں گے اور مطالعہ کا ذوق بھی پیدا ہوگا۔ ان میں موجود عمدہ نظمیں اور شعری پہلیاں زبانی یاد بھی کرائی جاسکتی ہیں۔

☆......بچوں کی شروع میں ٹھوس، علمی و تحقیقی مضامین سے دلچسپی نہیں ہوتی، اس لیے خارجی اوقات میں نصابی کتابوں کے علاوہ کچھ وقت سیرت وسوانح وغیرہ کی کتابوں کے لیے بھی ہونا چاہیے لیکن خارجی مطالعہ میں زیادہ انہماک بھی مناسب نہیں۔ خارجی اوقات میں کن کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، اس کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ کتابوں کا انتخاب اساتذہ خود کریں، اس میں زبان وادب کا شروع ہی سے لحاظ بہت مفید ثابت ہوگا، ابتدا ہی سے معیاری تحریروں کا مطالعہ ستھرے ذوق کا سبب بنتا ہیں، اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ معیاری کتابوں کی ایک فہرست ذہن نشین رکھیں۔

☆......اساتذہ کو چاہیے کہ گاہے گاہے بچوں کے سامنے مفید کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیات بھی بیان کرتے رہیں۔ یہ طلبہ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرتی ہے۔

☆......بچوں میں مطالعہ کا ذوق بڑھانے کے لیے ان میں مختلف مقابلے کرائے جائیں، یہ مقابلے کس قدر نفع بخش ثابت ہوتے ہیں، ہندوستان کی ایک ریاست کرناٹک کے ایک شہر "بھٹکل" میں بچوں کے لیے قائم کردہ "ادارہ ادبِ اطفال" کی ایک رپورٹ ملاحظہ ہو:

> "ادارہ ادب اطفال کے شعبۂ کتب خانہ کی طرف سے لاک ڈاؤن میں بچوں کی چھٹیوں کا صحیح طور پر استعمال ہو، اس کے لیے بچوں کے درمیان مطالعہ بیداری مہم کا انعقاد کیا گیا، جس میں ۱۲۵ بچوں نے شرکت کی، جن میں تیس بچوں نے (دو ماہ کے اندر) سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور ۲۰ بچوں نے ۵۰ سے زائد کتابوں کا مطالعہ کر کے کتاب دوستی کا ثبوت دیا۔۔۔ بچوں کی دلچسپی کی خاص بات یہ تھی کہ بچوں کے مطالعہ کے لیے رکھی گئی کتابیں رنگا رنگ اور خوبصورت، تصویروں سے پرکشش تھیں جن کو "فطرت لائبریری" میں ملک وبیرون سے لایا گیا تھا۔"

ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات میں کام کرنے والے ایسے اداروں کی کاوشوں کو نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو!

☆......☆......☆

علم و تحقیق

تمدن کیا ہے؟

مولانا طارق علی عباسی
استاذ دارالعلوم عثمانیہ سانگھی، ضلع سکھر

انسانی سوسائٹی میں انسانوں کے آپس میں رہنے سہنے کے خاص طریقے اور طرزِ معاشرت کو "تمدن" کہا جاتا ہے، تہذیب، کلچر، ثقافت اور عمرانیات کے الفاظ بھی بعض اوقات تمدن ہی کے مترادفات کے طور پر موسوم کیے جاتے ہیں، گو بعض فلاسفروں کے نزدیک اس کی تشریح و توضیح میں فرق بھی پایا جاتا ہے، مگر ان مختلف آراء کے قطعِ نظر دیکھیے تو انسانی سوسائٹی میں شہری بود و باش اور سماجی و سیاسی، معاشی و اقتصادی اور انسانی زندگی کے دیگر کاروبار کا بھی تمدن پر اطلاق ہوتا ہے۔

تمدن انسان کے خارجی ماحول اور اس کے باہمی عمل اور ردِ عمل کی ایک تخلیقی شکل و صورت ہوتا ہے۔ تمدن کا تعلق انسان کے سوچنے سمجھنے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افعال و حرکات اور پھر ان کے نتائج سے بھی ہے، انسان چونکہ اپنی طبیعت و ساخت میں شہریت پسند واقع ہوا ہے، اس لیے رفاہِ عامہ کا تخیل، حبِ مال و جاہ اور ایجاد و تقلید کا مادہ قدرت نے انسان کو بڑی ہی خوبی سے ودیعت فرمایا ہے۔

درحقیقت یہ تمدن وہ جبلت ہے جو صدیوں سے انسان کو اس پر چلائے آ رہی ہے کہ وہ مُتمدن زندگی گزارے، تمدن کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑے اور انسانی تقاضوں کو قدرت کی جانب سے مقررہ حدود میں رہتے ہوئے پورا کرے اور خود کو حیوانات سے متمیز رکھے تاکہ وہ ایسا اصلاح پسند اور بہتر معاشرہ قائم کر سکے جسے مدنیت کا درجہ دیا جا سکے اور جس پر تمدن کا اطلاق بھی صحیح طور پر متمکن ہو۔

اگر بات تمدن کے ترکیبی عناصر کے حوالے سے کی جائے تو ان میں دنیوی زندگی کا نیک چلن اور اخروی زندگی کا تصور، موجودہ زندگی کا درست نصب العین اور قدرت کی طرف سے عطا کردہ اساسی عقائد و

تعلیمات، تربیتِ افراد اور اجتماعی نظام کی پاسداری بنیادی طور پر شمار ہوتے ہیں۔ تمدن وتہذیب کی بقا کی ضمانت اور ارتقاع ان ہی عناصر پر مبنی ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ تمدن کا مدار صرف مادیت اور ظاہری زیب وآرائش اور ایجادات پر نہیں ہوتا کیونکہ جن چیزوں کی خوبیوں اور کشش کو دوام نہیں ہوتا، وہ اصل میں تمدن کی ترکیبی عناصر بن ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس دیکھیے تو تمدن اپنے اندر ایک دوامی روحانیت بھی رکھتا ہے جس میں فکری آزادی اور احساسات کی پاکیزگی، اعتدالِ جذبات کے ساتھ ساتھ پرخلوص خدمت گزاری اور اطاعت پذیری کے اعلیٰ اور مضبوط عناصر شامل ہوتے ہیں۔ تمدن تو سوچنے، سمجھنے اور عقل ونقل کے اعتبار سے درست عمل کرنے میں آزادی کا خواہاں ہوتا ہے، آزادی کے لیے جان و مال کا تحفظ، فرصت و اطمینان، انسانی سوسائٹی کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں تمدن کے اجزاء وعناصر بھی ہیں۔ پھر ان سب میں ایک اہم چیز نیکی ہے جو انصاف اور قانون کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، کسی کے یوں پوچھنے پر کہ تمدن کیا ہے؟ اور کسے کہتے ہیں؟ تو اسے بتایا جائے گا کہ تمدن حُسن وخوبی، آزادیٔ فکر ونظر، جدتِ تخیل، نیکی اور عدل کے قانون کی پابند عملداری، آرٹ، سائنس، فلسفہ، اور اخلاقِ حسنہ کو کہتے ہے۔

تمدن عبارت ہے انسانی قالب میں موجود روح اور عقل کے امتزاج سے اور دونوں کے باہمی تقاضوں کو فاطرِ ہستی کے زیرِ حکم و اہتمام پورا کرنے سے، ورنہ اس کے برخلاف تو تمدن یکسر مادی خود غرضانہ، من چاہی خواہشات وہفوات کا نمونہ، اور راہِ صواب اور انسانی اقدار کی کھلم کھلا خلاف ورزی کا عجوبہ ہوتا ہے، کثرتِ دولت، نت نئی ایجادات اور ظاہری قوت کے باوجود ایسا تمدن حقیقی آزادی اور انمول روحانی دولت سے بلکل بھی عاری ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ آج اپنے گرداگرد بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

یوں پھر تمدن اپنے صحیح معنوں میں برقرار نہیں رہ پاتا اور اس طرح دھیرے دھیرے صدیوں چلا آتا صحیح معنوں کا حامل تمدن اپنا وقار اور اپنی حقیقی تعریف کھو بیٹھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تمدن علم وعمل اور فطرتی حدود بندی اور اس کے لوازمات کو پورا کیے بغیر اور اس کے قدیم وجدید ذرائعِ حمل ونقل کے قطعاً بھی حاصل نہیں ہوسکتا، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانیت کی ہمہ گیر فیاضانہ خدمت اور باہمی سلوک کے لیے ناگزیر ہیں۔

تمدن اس انسانی حالت کا نام ہے جس میں انسان اپنے ارادے کی آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے خدمتِ خلق اور اطاعت وفرمانبرداری کے لیے خود کو وقف کر دینے کی مثال بنتا ہے، گزشتہ ہلاک شدہ قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مادی فتوحات، ان کے محلات ومقابر، اور ان کی دیگر اشیاء ایک گونہ حیرت انگیز تو ضرور ہیں اور آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے بھی کافی ہیں، مگر حقیقت میں یہ چیزیں ان کے تمدن کے کمال کا ہرگز بھی دلیل نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی بن سکتی ہیں، کیونکہ تمدن فکری اور روحانی آزادی اور ان کے لوازمات پر پورا اترنے سے ہی تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اقوام ان داخلی اور بنیادی چیزوں سے کما حقہ واقف نہیں تھیں یا ان مستحکم اصولوں پر گامزن نہیں ہوئیں۔ یہاں یہ بات بھی جانتے چلیں کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ اصول صرف گزشتہ قوموں کے ساتھ ہی متعلق تھا بلکہ یہی روش جاری رکھی گئی تو قانونِ قدرت سے تعلق رکھنے والے تمدن سے یہ انحراف ہوگا جو کسی بھی طرح متمدن کہلانے والے انسان کو زیب نہیں دیتا۔

صنعت وحرفت، فنون وہنر اور مادی وسائل کی ترقی بیشک تمدن کا حصہ ہیں مگر تہذیب وتمدن کا انحصار روحانیت اور اس سے جڑے ابدی پیغام پر ہی ہے، تمدن کے معانی میں ردوبدل کر کے نئی نسل کے سامنے ایک وضعی اور مصنوعی تمدن کھڑا کرنا یہ تمدن کا حقیقی تعارف نہیں ہے بلکہ یہ تمدن کے نام پر اس کے ساتھ نارَوا سلوک بلکہ بہت برا کھلواڑ ہے اور یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس میں بعض افراد ملوث ہونے کو یا ملوث ہونے کے باوجود اسے برا تک نہیں جان رہے۔

- بات یہ ہے کہ انسان کا تمدن اپنے کمال کو جب ہی پہنچے گا جب وہ اشیاء اور عناصرِ فطرت کی بخوبی پاسداری کرے گا، اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی تہذیب وتمدن کی ترقی کے لیے اپنے آپ میں وہ اخلاقِ حسنہ پیدا کرے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کریں جو اس کی اپنی زندگی کا مقصد اور تقاضا بھی ہے اور پھر وہ اپنی مکسوبات وغیرہ کو فطرت کے قوانین کے تحت ہی استعمال میں لائے اور تاریخی اعتبار سے اپنی عزت واحترام اور تمدنی روایات کو بلندی پر لے جائے تاکہ پھر وہ صحیح معنوں میں متمدن سوسائٹی کا انسان کہلایا جاسکے۔

دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کی کتابیں پڑھ کر دیکھ لیجیے آپ کو اچھے طریقے سے معلوم ہو جائے گا

کہ آج علومِ جدیدہ بھی اس چیز کی دوٹوک گواہی دے رہے ہیں کہ انسانی تمدن کی ترقی اور کمال کا نصب العین اس وقت ہی حاصل ہوسکتا ہے جب ہم انسان اپنے تمدن کی بنیاد تمدنِ قدرت کے اصول وضوابط پر رکھیں گے، اب ان اصولوں کے آداب واخلاق کا لحاظ ہمیں کہاں سے حاصل ہو؟ تو وہ صحیفۂ قدرت میں بحروفِ جلی نظر آئے گا، پھر ہے کوئی بصیرت وتدبر رکھنے والا انسان جوان بصائر وعبر پر نظر ڈالے؟

انسان جوں جوں ترقی کے زینے طے کرتا جاتا ہے تو اس کی بنیادیں دراصل تمدنِ قدیم ہی سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں...... یہاں یہ بات ملحوظِ نظر وخاطر رہے کہ یہاں تمدنِ قدیم اپنے مثبت معنی میں مراد لیا جارہا ہے نہ کہ منفی معنی میں...... تو اب اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تمدنِ قدیم کا غور وخوض کے ساتھ مطالعہ کرے تاکہ اسے انسانی تمدن کی ترقی کا نکتۂ آغاز اور نکتۂ ترقی وکمال اور تنزلی سے بچاؤ کے آثار و اسباب اور مختلف مسائل کو سلجھانے کے وسائلِ حل اور عبرت کے واضح نشانات معلوم ہوسکیں۔ ورنہ پھر بصورتِ دیگر کئی قسم کے مغالطے تمدن کے نام پر اٹھتے رہیں گے اور تمدن کا صرف نام ہی باقی رہے گا اور حقیقی تمدن انسان کی زندگی سے رخصت ہو جائے گا۔

اس لیے عقلمند انسان کو چاہیے کہ وہ تمدن کو صحیفۂ قدرت کے زیرِ مطالعہ میں دیکھے تو پھر اس کے سامنے کئی ثابت شدہ حقائق آشکارا ہو جائیں گے، رسم ورواج عادات واطوار اور معاملات ومعاشرت وغیرہ یہ تمدن کا قلب ہوا کرتے ہیں، اسی لیے شریعت رسم ورواج کے حوالے سے بھی بحث کرتی ہے، لہٰذا آج کے متمدن کہلانے والے انسان کو چاہیے کہ وہ غور وتدبر کرے کہ آج وہ جسے تمدن کہہ رہا ہے یا اپنی خواہشات کی پیروی میں ڈھل کر اپنے زُعم وگمان میں جو بھی تمدن کھڑا کر رہا ہے، وہ آخر کہاں تک صحیح تمدن کہلانے کے لائق ہے؟ کیونکہ متمدن کہلانے والی قومیں جب بھی قومی مصالح اور بامعنی زندگی رکھنے والے تمدن کی حدود سے تجاوز اور اعراض کرتی نظر آئی ہیں تو وہ فنا ہو کر رہ گئی ہیں اور جس پر صحیفۂ قدرت کچھ اس طرح گواہ ہے کہ:

هل تحس منهم من احد او تسمع لهم ركزًا

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔۔۔بحیثیت ادیب

مولانا محمد زبیر
معاون مدیر ماہنامہ الخیر

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جہاں ایک طرف جلیل القدر عالم و مُناظر، بلند پایہ فلسفی و متکلم اور خدا رسیدہ بزرگ و درویش تھے، وہاں دوسری طرف انشا پردازی و نثر نگاری اور فن شعر و شاعری میں بھی درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے لیکن ان کی عالمانہ و درویشانہ صفات اس قدر غالب تھیں کہ ان میدانوں میں ان کی شہرت چُھپ کر رہ گئی۔

اس مضمون میں ہم حضرت نانوتویؒ کی اردو اور فارسی شاعری اور اردو انشا پردازی کے کچھ نمونے نقل کریں گے جن سے قارئین اندازہ کرسکیں گے کہ اگر حضرت شعر و سخن اور ادب و انشا کو اپنی محنت کا میدان بناتے تو ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا۔

حضرتؒ کی اُردو شاعری:

مولانا کی شاعری کا بیشتر حصہ شرمندۂ طباعت نہیں ہوا ورنہ ان کی پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب اور دوسرے بزرگوں سے سنا کہ حضرت نانوتویؒ نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات میں اپنے اندر قدرت محسوس کرتا ہوں کہ پورا وعظ نظم میں کہہ جاؤں لیکن خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے میں اس سے احتراز کرتا ہوں۔

آپؒ کے قصائد کا ایک مجموعہ "قصائد قاسمی" کے نام سے مطبوعہ ہے، ان قصائد سے ان کی

شاعری، معنی آفرینی اور قادرالکلامی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس مجموعے میں شامل ان کا "قصیدہ بہاریہ" ایک سو اکیاون اشعار پر مشتمل ہے، صرف یہی ایک قصیدہ ان کے تخیل کی بلند پروازی، سلاست، روانی، آمد، بے تکلفی اور شاعری سے فطری مناسبت پر شاہدِ عدل ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے!

شرارِ دانۂ بارود کو لگے ہیں پھول　　عمومِ فیضِ بہاری سے آگ ہے گلزار

یہ فیضِ عام سر پر ہرن کے ہیں شاخیں　　بدن پہ شیر کے گل دم میں سیہ کے خار

بارود کے دانوں میں شراروں کی پیدائش کو پھول کہنا، ہرن کے سینگوں کو شاخ اور شیر کے جسم پر موجود قدرتی نقش و نگار کو گل قرار دے کر ان سب امور کو بہار کی قوتِ نشوونما کا کرشمہ بتانا نیز سیہ (ایک جانور جس کے جسم پر کانٹے ہوتے ہیں) کے کانٹوں کو بہار کی قوتِ نامیہ کا ممنون بنانا، یہ سب نہایت عمدہ مضامین ہیں۔

ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے!

سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ　　نسیمِ تیز کو کچھ شمع سے نہیں پیکار

یہ شعر لفظی و معنوی مناسبتوں کے اعتبار سے نہایت خوب ہے، شمع کو غنچۂ لالہ سمجھ کر نسیمِ تیز کا اسے گل کرنا صنعتِ ایہام کی خوب مثال ہے، علاوہ ازیں گل لالہ کو چراغ سے تشبیہ دینا عام ہے لیکن یہاں شاعر نے شمع کو غنچہ کہہ کر اور پھر نسیمِ تیز کی کارفرمائی سے اسے "گل" کر کے کمال ہی کر دیا ہے۔

اب "قصیدہ بہاریہ" کا وہ شعر ملاحظہ فرمائیں جو اس تحریر کا باعث و محرک بنا ہے، یہ قصیدہ پہلے بھی کئی بار مکمل پڑھ چکا ہوں مگر آج اس کے کچھ اشعار دورانِ مطالعہ سامنے آئے تو اس شعر کی شعریت اور شاعر کے تخیل کے اچھوتے پن نے دل و دماغ کو جکڑ لیا اور دن بھر یہ شعر وردِ زبان رہا ؎

بنا شعاعوں کی جاروب تیرے کوچہ سے مہر　　کرے ہے دُور اندھیرے کا روز گرد و غبار

سورج کو جاروب کش، اس کی کرنوں کو جھاڑو، تیرگیٔ شب کو گرد و غبار اور طلوعِ آفتاب کی وجہ سے اندھیرے کے خاتمے کو جاروب کشی قرار دینا ایک بالکل نیا، اچھوتا اور البیلا تخیل ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو اس قصیدے کا نہیں ہے۔

نگاہِ شوق کے صدمے کے داغ کا تل نام　　　غبارِ راہ ہے نورِ قمر دمِ تنویر

نگاہِ شوق سے پڑنے والے داغ کو تل قرار دینا، یہ بھی ایسا تخیل ہے جو کسی اور شاعر کے ہاں دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

حضرتؒ کی فارسی شاعری:

اُردو کی طرح حضرت نانوتویؒ کی فارسی نظم ونثر بھی ایسی ہے کہ جس پر اہل زبان کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ایک قصیدے کے کچھ اشعار دیکھیے!

فگن فگن برخِ گل شتاب برقعِ نور　　　کہ گرد ظلمتِ شب نہ زروئے پاکش دور

بکش بکش برخِ سبزہ زود چادرِ آب　　　کہ خاک زیریٔ بیجا است باد را دستور

بمال درشبِ مہ عطرِ بو بہ دامنِ گل　　　کہ پُر شدہ است ببیں جامِ مہ بادۂ نور

صبا بہ غنچہ بگو چشم بر کشا و مترس　　　کہ رفت مرکبِ بادِ خزاں زگلشن دور

ان اشعار کے معانی میں غور کریں تو البیلا تخیل اور اچھوتا پن معلوم ہوتا ہے۔روئے گل پر نور کا بُرقع جلد جلد ڈالنے کی ہدایت کرنا تا کہ چہرے پر تیرگیٔ شب کی گرد نہ پڑے، سبزے کے چہرے پر پانی کی چادر تاننے کی تاکید کرنا تا کہ ہوا کی خاک ریزی کی بے جا عادت سے اس کا چہرہ گرد آلود نہ ہو جائے، چونکہ جامِ ماہ بادۂ نور سے پُر ہو چکا ہے، اس لیے شبِ ماہتاب میں دامنِ گل کو خوشبو لگانے کا حکم دینا اور چونکہ گلشن سے خزاں کی سواری رخصت ہو چکی ہے، اس لیے صبا کے ذریعے غنچے کو یہ پیغام دینا کہ وہ بے خوف ہو کر آنکھ کھول لے، یہ سب نرالے مضامین ہیں اور اگر الفاظ کی طرف نظر کریں تو ان کی بندش وچستی اور فصاحت و بلاغت خوب ہے، اشعار شاعر کی فارسی شاعری سے فطری مناسبت کے غماز ہیں، فارسیت پر اہل زبان ہونے کا دھوکا ہوتا ہے اور قصیدے میں فارسی کے اساتذہ کے قصائد کا رنگ جھلکتا ہے۔

یہ مناجاتی نظم ملاحظہ کیجیے!

الٰہی غرقِ دریائے گناہم — تو می دانی و ہستی گواہم
گناہے بے عدد را بار بستم — ہزاراں بار توبہ ہا شکستم
حجابِ مقصدم عصیانِ من شد — گناہم موجبِ حرمانِ من شد
بآں رحمت کہ وقفِ عام کردی — جہاں را دعوتِ اسلام کردی
نمی دانم چرا محروم ماندم — رہینِ ایں چنیں مقسوم ماندم
گدا خود را ترا سلطاں چو دیدم — بدرگاہِ تو اے رحماں دویدم
دلم از از نقشِ باطل پاک فرما — براہِ خود مرا چالاک فرما
درونم را بہ عشقِ خویشتن سوز — بہ تیرِ دردِ خود جان و دلم سوز
دلم را محوِ یادِ خویش گرداں — مرا حسبِ مرادِ خویش گرداں
اگر نالائقم قدرت تو داری — کہ خارِ عیب از جانم برآری
بہ خوبی زشت را مبدل نمائی — سیاہی را بہ بخشی روشنائی
بچشمِ لطف،اے حکیمِ تو بر سر — بحالِ قاسمِ بے چارہ بنگر

اس مناجات میں شیخ فریدالدین عطار کے ”پندنامہ“ کی ابتدا میں موجود اس مناجات کا سا رنگ ہے ؎

پادشاہا جرمِ ما را درگزار — ما گنہ گاریم و تو آمُرزگار
تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم — جرم بے اندازہ و بے حد کردہ ایم

حضرت نانوتویؒ بحیثیت نثر نگار:

مرزا غالب نے خطوط نویسی میں اردو نثر نگاری میں جو دلکش اسلوب متعارف کرایا تھا، وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئے، بہت سے نامی گرامی ادیبوں نے مکتوب نگاری میں غالب کا تتبع کرنے کی

کوشش کی ہے لیکن غالب کے خطوط اور دیگر حضرات کے مکاتیب میں آمد وآورد اور تکلف و بے تکلفی کا فرق چشمِ بینا پر مخفی نہیں ہے۔ دراصل خطوط جو کہ تصنع سے پاک بے تکلفانہ تحریر کا مرقع ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں، ان میں ادبیت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑا ہی کمال ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خطوط اور دیگر نثری تحریریں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپؒ علمی مباحث کی بجائے عام خطوط یا کوئی اور تحریر لکھتے ہیں تو ان کی نثر اپنی فصاحت و بلاغت، سادگی وسلاست اور بے تکلفانہ ڈھنگ میں غالب کی نثر سے ملتی جلتی ہے۔

غالب کے خطوط کی اہم ترین خوبی خود غالب کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ذرا حکیم عبدالصمدؒ کے نام حضرتؒ کے ایک مکتوب کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں! وہی غالب والا انداز ملے گا کہ گویا دو دوست آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، جملے مربوط اور عبارت فصیح وشگفتہ ہے:

> ”مدت سے احبابِ دہلی متقاضی ہیں، اِدھر اپنا شوق بھی اُدھر کو کھینچتا ہے، اس لیے یہ ارادہ تھا کہ اگر دیوبند پہونچا تو اُدھر سے اُدھر دہلی بھی ہو آوں گا، مگر تواترِ امراض کے باعث یہ ارادہ ملتوی رہا۔ اب گو اچھا ہو گیا ہوں مگر کاہلی کے لیے یہ خفیف سی نقاہت کافی ہے۔ غرض ٹونک تک اپنی رسائی کی توقع نہیں۔“

حضرت نانوتویؒ کے خطوط بھی غالب کے خطوط کی طرح لمبے چوڑے آداب والقاب سے یکسر پاک وصاف ہیں، خطوط کی عبارت دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبارت آرائی اور تکلف نام کو بھی نہیں، بظاہر سوچنے کی ضرورت نہیں پڑ رہی ہے، بس جو کچھ دل میں ہے، وہی نوکِ قلم رقم کرتی جا رہی ہے۔ نصر اللہ خان نامی شخص کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”آپ کا عنایت نامہ پہونچا، یہ عنایت میرے سر پر، مگر میں حیران ہوں۔ نہ میں ایسا عالم نہ ایسا محقق، مجھ کو آپ نے کیوں اس کام کے لیے تجویز کیا؟ مجھ کو تو کبھی فتویٰ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا اور نہ میرے پاس اس کام کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین ومتاخرین کی بیاضیں جو میں اس کام کو سنبھالوں۔“

"آبِ حیات" کے دیباچے کی چند سطور پڑھیے اور سہلِ ممتنع النظیر نثر سے لطف اٹھایئے!:

"میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں؟ یہ سب اس شمس العارفین کی نور افشانی ہے۔۔۔ ورنہ اپنی ہیچ دامنی سے جس پر بے سروسامانی، دوسری پریشانی دوشاہدِ عدل گواہ ہوں، انکار نہیں کیا جاتا۔ بے سروسامانی کا حال پوچھیے تو نہ اپنے گھر میں کوئی عالم جو بوجہ قدردانی علم کی طرف لگائے، نہ اپنے دل میں شوق جو تحصیل علم میں مزا آئے اور اس کام سے دل نہ گھبرائے، نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب جی چاہا اٹھایا دیکھ لیا، نہ روپیہ پیسہ کا ایسا حساب کہ حسبِ دلخواہ ضروریاتِ تحصیل میں لیا، صرف کیا، اور پریشانی کی کیفیت پوچھیے تو کچھ نہ پوچھیے! ایک دل ہزار مقصود پھر ہر مقصود کے لیے ہزار غم موجود، ایک بات ہو تو کچھ بات بھی ہے۔ پھر کس کس کو حاصل کیجیے جو دل کو قرار آئے اور دل کی پریشانی جائے، ساری تمنائیں بر آئیں تو ہم میں اور خدا میں کیا فرق رہ جائے؟ اور سب ارادوں سے دست بردار ہو جایئے اور خدا کے ہو رہیے تو ایسی عقل اور ایسی ہمت کہاں سے آئے؟ کہ بجز نام خدا اور کچھ نہ بھائے، یہ نصیب ہو تو پھر کیا بات! نعمت ولایت ہم جیسے نابکاروں کو ہاتھ آجائے۔"

"قبلہ نما" کے دیباچے کا یہ اقتباس پڑھیے اور سر دُھنیے! عبارت کیا ہے، حقیقتِ واقعیہ کے طنزِ لطیف کے ساتھ خوبصورت اظہار کا ایک کیفِ مرکّب ہے جس پر بیان کی سلاست، عبارت کی بے تکلفی اور آورد سے پاک خیالات کی آمد مستزاد ہے۔

"ہر چند چاہا کہ مجمعِ عام میں پنڈت جی کے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بعنایتِ خداوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں، مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے جو میدانِ مناظرہ میں آتے۔ جان چرانے کے لیے وہ داؤ کھیلے کہ کاہے کسی کو سوجھتے ہیں! اعتراض تو مجمعِ عام میں کیا کیے، پر مناظرہ میں اپنی قلعی کھلنے کا وقت آیا تو پچاس آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ تھے۔ وجہ پوچھی تو اندیشۂ فساد زیبِ زبان تھا، مگر نہ پہلے مناظروں کی نظیروں کا کچھ جواب، نہ حسنِ انتظامِ سرکاری پر کچھ اعتراض۔
ٹلانے کے لیے دعوائے بے دلیل سے مطلب تھا۔ رمضان کی آمد آمد ان کو بھی معلوم تھی اور اس وجہ سے یہ امید تھی کہ کچھ دن اور ٹلیں تو یہ لوگ آپ ٹل جائیں گے۔ اس لیے منتیں

کیں، غیرتیں دلائیں، حجتیں کیں، سعییں کرائیں، مگر وہاں وہی نہیں کی نہیں رہی۔"

کسی علمی مضمون کو بیان کرتے ہوئے تحریر میں ادبی چاشنی کو برقرار رکھنا کس قدر مشکل کام ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو قلم وقرطاس سے واسطہ اور نوشت وخواند سے سابقہ رکھتا ہے۔ ملاحظہ کریں کہ حضرتؒ ان دونوں کشتیوں پر بیک وقت کیسے کامیاب سواری کرتے ہیں۔

"اب ہم اگر اس بات کو یاد دلا کر کہ ازواج مطہرات کا امہات المومنین والمومنات ہونا رسول اللہ ﷺ کی ابوت کی فرع ہے، یوں دعویٰ کریں کہ رسول اللہ ﷺ کی روح پرفتوح مومنین کے وجود روحانی خاص کر جزِ ایمانی کے لیے واسطہ فی العروض ہے اور ارواح مؤمنین عارض بمعنی مذکوراعنی ارواح مؤمنین آپ کی روح اقدس کے آثار ہیں اور آپ ابوالمومنین ہیں۔تو ہم جانتے ہیں کہ قدردان جن کو بیانِ نکاتِ آیات سے ترقی ایمانی ہو اور محبان حبیب رب العالمین ﷺ جن کو آپ کی شرح کمالات سے شادمانی ہو، ایسے شاد ہو کر ان باتوں کو یاد کریں جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز جو عزیز بھی ہو پھر ہاتھ آجائے اور اس کو سنبھال کر رکھیں۔ بلجملہ اللہ جس کی طبیعت سلیم اور ذہن مستقیم ہے، ان باتوں کو سن کر شاد ہوں گے اور سمجھ کر داد دیں گے اور کیوں نہ ہو، یہ تقریر کلام اللہ کے "تِبیاناً لکلّ شیئٍ" اور معدن الحقائق ہونے کے لیے عمدہ شاہد ہے اور رسول اللہ ﷺ کے شرف اور افضلیت کے لیے برہانِ کامل ہے۔ دفع شبہات کے لیے جو دربارۂ خصوصیات ضعیف الایمانوں کے دلوں میں آتے ہیں جو کچھ لکھا گیا ہے اور ان شاءاللہ لکھا جاوے گا، ماخذ صحیح ہے اور ازالۂ ترددات کے لیے جو دربارۂ کلام ربانی ہونے قرآن کے اور رسول حقانی ہونے حضرت حبیب الرحمن کے بعض طالبوں کے دلوں میں پڑ جاتے ہیں تقریر فصیح ہے۔"

باقی جہاں کہیں حضرتؒ اپنے حقیقی رنگ میں ٹھیٹھ علمی نکات فلسفیانہ طرز میں بیان کرتے ہیں، ارباب نظر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ وہ بھاری پتھر ہے جو ہر معمولی اور واجبی استعداد کے حامل فضلاء سے اٹھایا نہیں جا سکتا، بس اسے چوم کر چھوڑ دینا چاہیے۔ بطور نمونہ از خروار آبِ حیات کی چند سطور پیشِ خدمت ہیں:

"عدمِ وجود مشتبہ ہو کر کبھی وجودِ عدم معلوم ہوتا ہے، ایسے ہی عدم العلم مشتبہ بعلم العدم ہو

جاتا ہے۔مثلاً سایہ عدم النور ہے اور بایں نظر کہ نور ایک امرِ وجودی ہے تو عدم النور کو عدم الوجود کہہ سکتے ہیں لیکن وقتِ ارتفاعِ آفتاب وصفاءِ جوّ اگر کسی میدانِ مستوی میں جس میں نہ کوئی آڑ ہو، نہ پہاڑ نہ درخت ہو، نہ جھاڑ کوئی شخص تن تنہا جائے اور اپنے سایہ کی طرف نظر دوڑائے تو ایسے وقت میں میدان میں اس کا سایہ جو عدمی ہے، وجودی معلوم ہوتا ہے اور دھوپ جو وجودی ہے، عدمی (معلوم ہوتی ہے)۔خاص کر وقت حرکت کہ اس وقت وہمِ غلط کار نظرِ حقیقت بین کی ایسی نظر بندی کرتا ہے کہ دھوپ کی طرف وجودی ہونے کا احتمال بھی نہیں جاتا، سایہ ہی کو وجودی سمجھ لیتے ہیں۔

اب دیکھیے یہاں عدم الوجود بمنزلہ وجود العدم ہے، ایسے ہی علم کو سمجھیے۔اعنی دھوپ کی جانب علم ہے اور سایہ کی جانب عدم العلم، مگر بادی النظر میں دیکھیے تو دھوپ کی جانب عدم العلم اور سایہ کی طرف علم العدم معلوم ہوتا ہے۔سو جس کو علمِ عدم بطورِ انتزاع سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں عدم العلم اور عدمِ انتزاع ہے۔مگر بوجہِ اشتباہ برعکس معلوم ہوتا ہے اور جب علم ہی نہیں تو پھر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوسکتا کہ علمِ عدم اس کے تحقق اور قابلیتِ انتزاع پر دلالت کرتا ہے۔بہرحال عدم کے لیے کسی درجے کا تحقق ہی نہیں جو قابلِ انتزاع ہو۔اور ہو تو کیونکر ہو؟ اجتماع النقیضین اور اجتماع الضدین اور اتصاف الضد بالضد اگر ممکن ہو تو عدم کے لیے بھی وجود ہو“

یہ وفورِ علم اور قادرالکلامی کی دلیل ہے کہ جب حضرتؒ اپنے مخصوص فلسفیانہ ومتکلمانہ انداز میں لکھتے ہیں تو متواتر کئی صفحات تک ہر ہر سطر ایسی دقیق علمی اصطلاحات کی حامل ہوتی ہے کہ انتہائی ذکیُّ الطبع اور جیّدُ الاستعداد حضرات کے اذہان ہی اس کے مطالب ومفاہیم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جونہی ان کا قلم اپنے اس طرزِ خاص کو چھوڑ کر سادہ نگاری وسلیس نویسی پر آمادہ ہوتا ہے تو آپ صفحوں کے صفحے پڑھ جایئے، کہیں بھی کوئی ثقیل لفظ نہیں ملے گا، عبارت کی سلاست اور روانی، کسی بہتے دریا کی رواں موجوں کی طرح نظر آئے گی جو قاری کو بھی اپنے بہاؤ کے ساتھ ساتھ لیے جاتی ہے۔

☆……☆……☆

کارِ جہاں بینی

رسائل ومجلّات کی اہمیت

مولانا عبدالمتین منیری

یہ حقیقت ہے کہ علم میں گہرائی اور ایک حد تک معلومات میں وسعت دونوں مطلوب ہیں، جہاں علم کے گہرے کنویں میں غوطہ زنوں کی ضرورت ہے، وہیں معلومات کے وسیع سمندر میں تیرا کی جاننے والے بھی مطلوب ہیں اور تفسیر وحدیث وفقہ کی باریکیوں کو جاننے والوں کے ساتھ جدید دور کے تقاضوں اور نئے اٹھنے والے فتنوں کی جانکاری، اور ان کا توڑ جاننا بھی ضروری ہے، یہ کام صرف قدیم کتابوں کا دامن تھامنے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ پرانی کتابوں میں کسی مسئلہ کے حل کی بنیادیں تو مل سکتی ہیں، نئے رونما ہونے والے مسائل پر چاروں طرف سے روشنی پڑنا بھی مشکل ہوتا ہے، اور حالات بھی کبھی ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ علماء وفقہاء کی کاوشیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں سولہویں صدی کے دوران فقہاء کا دعوی سامنے آیا تھا کہ ہم نے فقہی مسائل پر اتنی دماغ پاشی کی ہے کہ آئندہ چھ سو سال تک آنے والے مسائل کے حل کے لیے ہماری کتابیں کافی ہوں گی، نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں ہوگی، اور واقعی ہمارے فقہاء نے اتنی محنت اس پر کی تھی لیکن ہوا کیا، جس دور میں یہ کتابیں تصنیف کی گئی تھیں، وہ نظریاتی دور تھا، سائنس کی ایجادات ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں لیکن جیسے ہی دنیا سائنس کے دور میں داخل ہوئی اور نئی نئی ایجادات تیزی سے سامنے آنے لگیں اور دنیا نظریاتی سے سائنس کے تجرباتی دور میں داخل ہوگئی، تو ہماری فقہ کی کتابیں اس تیز رفتار تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکیں، یہ سلسلہ اب تک جاری ہے، سائنسی، اقتصادی، طبی، وغیرہ

ایسے نت نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، جن کا اطمینان بخش حل سامنے نہیں آرہا ہے۔

دو سال قبل جب کورونا کی وبا عام ہوئی تھی، تو سائنس دانوں نے کہا تھا کہ ہر بیماری کا علاج قدرت کے یہاں موجود ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی وبا آتی ہے تو اس کا علاج تلاش کرتے کرتے چھ ماہ گزر جاتے ہیں، جب دوا ایجاد ہوتی ہے تو پھر اس کا تجربہ کرنے میں مزید چھ ماہ لگ جاتے ہیں، جب دوا کامیاب ہوکر مارکیٹ میں آتی ہے، اس وقت تک پرانا وائرس ختم ہوکر نیا وائرس میدان میں آجاتا ہے اور یہ دوا بے کار، پھر نئے وائرس سے بچاؤ کی کوششوں میں لگنا پڑتا ہے۔

کچھ یہی صورت حال عصر حاضر میں اٹھنے والے جدید مسائل، رجحانات اور چیلنجوں کی ہے، ایک تو ہمارے دینی مدارس اور دار العلوموں کی مشکل یہ ہے کہ ان میں کتب خانوں میں کتابیں محفوظ تو رہتی ہیں لیکن ان تک رسائی عموماً ممکن نہیں ہو پاتی، جس کی وجہ سے طلبہ میں مطالعہ اور کتب بینی کا شوق پیدا نہیں ہوتا، اور اساتذہ کا بھی یہ حال ہوتا ہے کہ چونکہ وہ بھی طالب علمی کے اسی ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں، اور ان کی مصروفیات بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں تو زیادہ تر کو کتابوں کے اس بحر بے کراں سے استفادہ کی فرصت ہی نہیں ملتی، نہ وہ طالب علمی کے دور سے پڑی ہوئی عادتوں کو بدل پاتے ہیں، جو عادتیں طالب علمی میں پڑتی ہیں، وہی آخر عمر تک رہتی ہیں، طالب علمی میں درسیات اور چند مراجع تک طالب علم محدود رہے، تو تدریس کے دوران بھی اس ریکھا کو پار کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے ہمارے علماء وفارغین کی بڑی اکثریت جدید معاشروں میں نکّو بن کر رہ جاتی ہے، جو مسائل پر ہماری سوسائٹیوں میں گفتگو کا محور ہوتے ہے، ان سے یہ نابلد ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارے علماء وفارغین کو جدید دور اور اس کے مسائل سے ناواقف سمجھا جاتا ہے، اور انہیں صرف بزرگ اور اللہ والے کی حیثیت دے کر برکت کے لیے کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک عالم دین کو معاشرے میں اپنی دعوتی اور علمی ذمہ داری نبھانے کے لیے مجلّات سے مندرجہ ذیل طریقہ سے مدد ملتی ہے:

۱......: علمی اور دقیق کتابوں کے مطالعہ کے لیے مخصوص بیٹھک اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے، آج کے دور میں طباعت کے اعلیٰ معیار اور بھاری کاغذ کے استعمال نے ان کتابوں کو کافی وزنی بنا دیا

ہے، اب کتاب کی کسی جلد کو دس پندرہ منٹ تک ہاتھ میں اٹھا کر پڑھنا ممکن نہیں رہا ہے اور پھر اس کے لیے یکسوئی کہاں سے لائی جائے، لہذا علمی ودقیق کتابوں کو ہی پڑھتے رہنے کی ترغیب ایک وعظ شیریں تو ہوسکتا ہے، لیکن اسے عملی شکل دینا ایسا آسان نہیں ہے۔ لہذا ہلکی پھلکی اور چھوٹے وزن کی کتابوں اور مجلّات کا مطالعہ، نہایت ضروری ہے۔ اسی چیز کو خیال میں رکھ کر کینڈل کمپنی نے اپنے ای بک ریڈر کا حجم ایک ہتھیلی اور دوسو گرام سے زیادہ بڑھنے نہیں دیا ہے۔

۲......: ایک عالم دین اور داعی کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لیے جدید اسالیب سخن اور موثر انداز تخاطب سے واقفیت بے حد ضروری ہے، مجلّات اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

۳......: جب نئے مسائل اور فکری اور نظریاتی چیلنج رونما ہوتے ہیں تو ان کی تحقیق کرکے کوئی کتاب نکلتی ہے تو اس وقت تک کورونا وائرس کے علاج کی طرح، اس کتاب کے لکھتے، طباعت کے مرحلوں سے گذرتے اور بازار میں آتے آتے سال بھر گزر جاتا ہے لیکن مجلّات چونکہ ہفتہ وار یا ماہانہ نکلتے ہیں تو پھر کتابیں آنے کا انتظار کئے بغیر جلد ہی مطلوبہ معلومات ان میں دستیاب ہوجاتی ہیں۔

۴......: رسائل میں نئی کتابوں کی معلومات اور تبصرہ، اور شخصیات اور وفیات کے تذکرے شائع ہوتے ہیں، جو کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتے اور عموما ایسا ہوتا ہے کہ جو قیمتی مضامین مجلّات میں شائع ہوتے ہیں، ان میں سے بہ مشکل ایک تہائی یا چوتھائی ہی دوبارہ چھپ پاتے ہیں، ورنہ یہ زیادہ تر تاریخ کے غبار میں چھپ جاتے ہیں۔ ان مجلّات میں ایسی نادر معلومات ہوا کرتی ہیں جو کہیں اور نہیں ملا کرتی، اس کی اہمیت دیکھنا ہو تو، وفیات ماجدی، تبصرات ماجدی، مولانا ماہر القادری کے تبصرے، وفیات معارف، وفیات برہان، دیکھ لیں، جن لوگوں نے محمد خیر رمضان یوسف کی **تکملة الاعلام** دیکھی ہے، وہ کہیں گے کہ یہ مجموعہ تو سارے کا سارا **البعث الاسلامی** لکھنو، اور **الفیصل** ریاض کا چربہ ہے۔

۴......: مجلّات بایزید بسطامی کے دسترخوان کی طرح ہوتے ہیں، جن میں ہر کوئی اپنے رجحان کے مطابق معلومات کا پیٹ بھر لیتا ہے، جب مجلّات چھپتے ہیں تو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا،

لیکن جب ان کے اشاریئے آتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض مجلّات نے ایک ایسے بڑے دائرہ معارف کی شکل اختیار کی ہے جن کے سامنے بڑے بڑے انسائیکلوپیڈیائی قسم کی کتابیں ہیچ ہیں اور معلومات کی ندرت اور خود ان مجلّات کی نایابی کی وجہ سے جن کتب خانوں یا شخصیات کے پاس یہ محفوظ رہتی ہیں ان کی حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر عالمی معیاری جامعات نے ڈاکٹریٹ کے اور تحقیقی مقالات میں مجلّات سے استفادہ کو لازمی قرار دیا ہے۔ جن لوگوں نے احمد حسن الزیات کے عربی زبان کے مایہ ناز ہفت روزہ **الرسالہ** مصر کی بیس سالہ فائلیں اور علامہ رشید رضا مصری کے **مجلة المنار** کی پینتیس سالہ فائلیں اور ان کے اشاریئے دیکھے ہیں، وہ اش اش کر اٹھیں گے، یہ مجلّات معلومات کا انسائیکلوپیڈیا بننے کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹھنے والی عالم عرب کی ادبی علمی و دینی وسیاسی تحریکات کی ڈائریاں بن گئی ہیں، اردو زبان کے مجلّات بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ بعض تو ان سے بھی آگے ہیں۔ معارف اعظم گڑھ نے ایک سو سال پورے کر لیے، اسی طرح برہان، دہلی اور ترجمان القرآن، لاہور، اور سچ، صدق اور صدق جدید ہیں، جہاں ان کی فائلیں اور اشاریئے موجود ہیں، ان سے پوچھئے کہ کیا کچھ علمی وادبی وتاریخی انمول خزانے ان میں پوشیدہ ہیں اور ان کا کھلنے والا ایک ایک ورق ھل من مزید کی دعوت دیتا ہے۔

الحمد للہ اس ناچیز کو کتابوں سے تعلق کا جو بھی ذوق پیدا ہوا، اس میں ان مجلّات کا بڑا ہاتھ رہا ہے، مولانا قاضی شریف محی الدین اکرمی مرحوم کے یہاں، القاسم دیوبند، الابقاء تھانہ بھون، دارالعلوم دیوبند، نور الاسلام (فرید وجدی کی ادارت میں مجلة الازھر کی پہلی پانچ جلدیں۔ اور الازہر کی ابتدائی جلدیں)، **البعث الاسلامی** لکھنو کی ابتدائی جلدیں۔ سچ لکھنو کی پانچ فائلیں، شامل تھیں، غریب خانہ میں مدیر مسئول البلاغ بمبئی کو تبادلہ میں، برہان دہلی، صدق جدید لکھنو، اہل حدیث دہلی، تعمیر حیات لکھنو، ندائے ملت لکھنو، معرفت حق الہ آباد، رہنمائے صحت کلکتہ، الفرقان لکھنو اور نہ جانے کیسے کیسے مجلّات آتے تھے، اسی طرح صدیق لائبریری بھٹکل کا وسیع ذخیرہ بھی دسترس میں تھا، جس کا تفصیلی تذکرہ ایک مستقل مضمون میں ہم نے کیا ہے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں آنے والے

مجلّات کی فہرست اس سے جدا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارا وقت مجلّات کی خواندگی میں گزرتا تھا، کسی مجلہ میں ایک دو دلچسپی کے مضامین مل جائیں تو قیمت وصول ہو جاتی ہے۔

اس وقت اردو مجلّات کی کثرت ہے اور ان کا معیار بہت گھٹ گیا ہے، بڑے بڑے دار العلوموں کے اپنے مجلّات کے معیار کی بلندی پر توجہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے پڑھنے والوں کی دلچسپی ان میں کم ہو گئی ہے لیکن اس گئے گذرے دور میں بھی چند جگنو ٹمٹمارہے ہیں، ان کی روشنی جب آنکھوں میں پڑتی ہے تو پھر امید کی ایک کرن ابھرتی ہے کہ ماضی کے بجائے، حال میں، اور مستقبل کے لیے جینے والے اب بھی چند لوگ زندہ ہیں، جو علم وفکر کی شمع جلائے ہوئے ہیں، گھپ اندھیرے میں روشنی دینے والی ان چند شمعوں کی پھیلنے والی شعاعوں کا انتظار رہتا ہے اور غیر معیاری اور اشتہاری قسم کے مجلّات کی بھیڑ بھاڑ میں، ان چند معیاری مجلّات کا انتظار علم وکتاب کے دیوانوں کو ہمیشہ رہتا ہے۔

جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے

جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے　　رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے　　کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے بستی دل کی
پیچھے رہ جاتے ہیں سب ساتھ نبھانے والے　　ایک پل چھین کے انسان کو لے جاتا ہے
کیا کہوں اے مرے دل میں اتر آنے والے　　لوگ کہتے ہیں کہ تُو دور افق پار گیا
خواب ہی ہو گئے تعبیر بتانے والے　　جانے والے، ترے مرقد پہ کھڑا سوچتا ہوں
چھیڑ جاتا ہے مرے زخم پرانے والے　　ہر نیا زخم کسی اور کے سینے کا سعود

سعود عثمانی

مراسلے

ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے نام مولانا عبدالماجد دریابادی کے چند خطوط

پروفیسر عظمت حیات

اسسٹنٹ پروفیسر (شعبۂ اُردو)

گورنمنٹ کالج پنڈی گھیب، اٹک

ممتاز محقق، نقاد، مضمون نگار، بچوں کے ادیب، کہانی نویس اور شاعر ڈاکٹر محمود الرحمان (۱۹۳۵ء تا ۲۰۱۰ء) کا تعلق قصبہ کاکو، ضلع گیا، صوبہ بہار کے سادات کے ایک ممتاز مذہبی، روحانی، علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ وقت کے سیاسی تناظر میں اپنے آبائی وطن کے حالات ناسازگار دیکھ کر انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور سال ۱۹۵۵ء کے اوائل میں کراچی آ گئے۔ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم اے اُردو کی تکمیل کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسّی کے عشرے میں اسلام آباد منتقل ہو گئے اور تادمِ مرگ اسی شہر میں مقیم رہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف عمر بھر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ انھوں نے مختلف اصناف میں ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ جن میں سے کچھ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

اردو میں بچوں کا ادب، جنگِ آزادی کے اردو شعراء، اصطلاحاتِ طباعت وترسیم، تاریخی جائزے، بچوں کا ادب: کتابیات، قائدِ اعظم اور اردو، شاد عظیم آبادی: کتابیات، داغ دہلوی: کتابیات، تنقید وتشریح، یگانہ چنگیزی ایک مطالعہ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، مت سہل ہمیں جانو، حالِ جنوں، نظامی بنسری، قلندرِ زماں شاہ زادہ اسد الرحمان قدسیؒ: احوال وآثار، ذکرِ جمیل، مولانا

جلال الدین رومیؒ ، احمد ندیم قاسمی : حیات وافکار، سبدِ گل، تحریکِ آزادی کی نظمیں، آزادی کے مجاہد (دو حصے)، قومی شعور کے معمار، روشنی کے مینار، ہمارے قائد-ہمارے رہبر۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنی بھرپور علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے سلسلے میں وقت کے متعدد اہلِ علم سے خط و کتابت کا تعلق بھی رکھا۔ اسی سلسلۂ مراسلت میں سے ان کے نام بیسویں صدی عیسوی کی معروف علمی و ادبی شخصیت مولانا عبدالماجد دریابادی کے چھے نایاب خطوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۷۷ء) دریاباد ضلع بارہ بنکی، اودھ میں پیدا ہوئے۔ والد مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کے بعد مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ میں داخلہ لیا مگر والد صاحب کی وفات کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ مختصر عرصے کے لیے دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران میں سچ اور صدق کے ذریعے عملی صحافت اور ادارت کی ابتدا کی۔ مغربی فلسفہ وافکار کے مطالعے سے متاثر ہو کر تاویل و تعبیر کی وادیوں میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ الحاد و ارتداد کے قریب پہنچ گئے۔ مگر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دستِ حق شناس پر بیعت ہو کر مذہب کی اہمیت و صداقت کے قائل ہو گئے۔ اردو دان طبقے میں مولانا دریابادی کی شناخت ایک ادیب، صحافی، مترجم، فلسفی اور ماہر علومِ اسلامی کی ہے۔ انھوں نے متعدد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ کچھ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: فلسفۂ جذبات (۱۹۱۴ء)، روح الاجتماع، مبادی فلسفہ، تصوفِ اسلام، منطقِ استخراجی واستقرائی، الحیوانات فی القرآن، ارضِ قرآن، اعلام القرآن، خطباتِ ماجدی، مناجاتِ مقبول (مولانا اشرف علی تھانوی کے رسالے کی تسہیل) آپ بیتی (خودنوشت) مکتوباتِ سلیمانی، حکیم الامت: نقوش و تاثرات، سائیکالوجی آف لیڈرشپ۔

زیرِ نظر خطوط کے متن میں مکتوب نگار کے طریقِ املا کو برقرار رکھا گیا ہے۔ البتہ مکتوب نگار کے ذاتی کوائف یا تاریخ کے اندراج، رموزِ اوقاف کے استعمال اور پیرابندی میں حالیہ مروج اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ بعض معاملات اور مقامات کی توضیح میں حاشیہ آرائی بھی کی گئی ہے۔ متن اور حواشی میں کتب و رسائل کے نام سرخطی سے نمایاں کیے گئے ہیں۔

(خط:۱)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۹/اکتوبر ۱۹۵۹

کرم گستر!

وعلیکم السلام۔ مستقل مضمون (وہ چھوٹا ہی ہو) لکھ بھیجنے کی فرصت کہاں سے لاؤں؟ آپ خود اگر لکھ بھیجیں تو اس پر ایک نظر کر لینا البتہ ممکن ہے(۱)۔ پاکستان (لاہور، کراچی، ملتان وغیرہ) میں حضرت تھانویؒ (۲) کے مریدین بلکہ خلفاء بھی متعدد موجود ہیں۔ان سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔کتابوں میں ان لوگوں کے اشعار مل سکتے ہیں۔

حضرتؒ پر کتابیں (۳) میرے علم میں تین ہیں:

۱۔اشرف السوانح مع خاتمہ السوانح (۴ جلدیں) از خواجہ عزیز الحسن مجذوب (۴)

۲۔حکیم الامت: نقوش وتاثرات از عبدالماجد دریابادی (۵)

۳۔سیرۃ الاشرف از منشی عبدالرحمان خان ملتانی (۶)

ایک آدھ چھوٹا رسالہ کوئی اور بھی ہے۔ہندوستان (صدق بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنو) سے اگر کوئی کتاب منگانا ہو تو منشی عبدالرحمان خان، ادارۂ نشر واشاعت، فیصل بک ملتان کے ذریعہ سے منگائی جا سکتی ہے۔والسلام

عبدالماجد

(خط:۲)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۸/اپریل ۱۹۶۱ء

کرم گستر!

وعلیکم السلام۔آپ نے اب تک اس موضوع پر جو کچھ کام کیا ہے یا جو خاکہ بنایا ہے، وہ اگر بھیج دیں تو اس پر کچھ عرض معروض ان شاءاللہ کر دوں گا۔اس سے زیادہ کچھ وقت دینے کی خدمت سے بالکل معذور ہوں۔(۷) والسلام

عبدالماجد

(خط:۳)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

یکم فروری ۱۹۶۹ء

جنابِ من!

وعلیکم السلام۔ آپ کے کلماتِ تعزیت وہم دردی کا اجر اللہ آپ کو عطا کرے۔(۸)

والسلام

عبدالماجد

(خط:۴)

ہفتہ وار صدقِ جدید دریابادی، ضلع بارہ بنکی

۹؍جون ۱۹۶۹ء

وعلیکم السلام! بغیر آپ کی کتاب کا ایک لفظ دیکھے پڑھے، اس پر پیش لفظ لکھ ڈالنے کی جرأت کہاں سے لاؤں؟ ایمان بالغیب میں ترقی اس حد تک کہاں ممکن ہے!! تاہم آپ نے جو بڑی مفصل فہرستیں اپنے مآخذ ومصادر کی بھیج دی ہیں، انھیں سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ کتاب بھی بہت اچھی اور پڑھنے کے قابل ہو گی۔ نذیر احمد(۹)، اسماعیل میرٹھی(۱۰)، الیاس مجیبی (۱۱) وغیرہ سب اپنے اپنے رنگ میں بہت اچھا کام کر گئے۔ اور بچوں کے ہاتھ میں ایسی کتابیں دے گئے جو بہ اعتبارِ زبان سلیس وسہل ہیں اور معنوی اعتبار سے ادبِ صالح وصحت مند میں شمار ہونے کے قابل۔ آپ کی کتاب سے امید یہی ہوتی ہے کہ وہ خوب تلاش اور تحقیق سے لکھی گئی ہوگی۔ اور موجودہ نسل کے لیے بہترین شمعِ راہ ثابت ہوگی۔

والسلام

عبدالماجد

(خط:۵)

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۵ / مارچ ۱۹۷۰ء

مکرّم!

وعلیکم السلام۔ سیارہ (۱۲) کے ''خالد نمبر'' (۱۳) کا ذکرِ خیر تو صدق (۱۴) میں مدت ہوئی آچکا ہے اور مرموزِ میر مغنی (۱۵) کے تعارف کو بھی تین ہفتے ہو چکے ہیں۔ دفتر نے دونوں تراشے حسبِ دستور ضرور ہی پبلشر کو بھیج دیے ہوں گے۔ احتیاطاً اب انھیں دوبارہ بھیجنے کو لکھے دیتا ہوں۔ ان شاء اللہ اب ضرور پہنچ جائیں گے۔ خالد صاحب کو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔ ان کے حق میں دل سے دُعا نکلتی رہتی ہے۔

والسلام

عبدالماجد

(خط:۶)

ماہ نامہ صدق، لکھنؤ

محمود پرویز کا کوی صاحب! سخن سنج جس طرح شاعر کے معنی میں ہے، سخن فہم یا نقاد کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ صائبؔ (۱۶) کا مصرع ہے:

اے فیضِ سخن یکساں سخن سنج و سخنور

اس میں سخن سنج کا تقابل سخن ور سے ظاہر ہے۔ بہارِ عجم (۱۷) میں ایک شعر نظامیؔ (۱۸) کا بھی نقل ہوا ہے۔ جس کا مصرع ہے:

سخن سنج آمد ترازو بدست

لغاتِ سعیدی (۱۹) وغیرہ میں یہ تصریح درج ہے اگر چہ بعض اہلِ لغات سے سہواً یہ دوسرا مفہوم رہ گیا ہے؛ اور عجب نہیں کہ شبہ کی بنیاد یہی ہو!!

(عبدالماجد)

☆......☆......☆

حواشی وتعلیقات

ا۔ڈاکٹرمحمود الرحمان اپنے مرشد حضرت شاہ اسدالرحمان قدسیؒ کے نام مشاہیر کے خُطوط مرتب کرنا چاہتے تھے۔وہ مکتوب نگاروں کے مختصر کوائف بھی دینا چاہتے تھے۔مکتوب نگاروں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی شامل تھے۔اسی سلسلے میں انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے حضرت تھانوی پر مختصر مضمون کی درخواست کی تھی۔

۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳ء تا ۱۹۴۳ء)۔ حضرت تھانویؒ بیسویں صدی کے برِصغیر کے مسلمانوں میں غیر معمولی اثر ورسوخ کے حامل تھے۔ انھوں نے علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت امداداللہ مہاجر مکیؒ کے دستِ حق شناس پر بیعت ہوکر سلوک کی منازل طے کیں۔مرشد کے حکم پر تازیست تھانہ بھون میں رشد وہدایت اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔سینکڑوں کتابیں اور مختصر رسالے تصنیف کیے۔لڑکیوں اور عورتوں کے لیے لکھی گئی کتاب بہشتی زیور کو قبولِ عام حاصل ہوا۔

۳۔مسلمانانِ برِصغیر کی روحانی ،مذہبی،علمی،عملی ،سماجی اور سیاسی زندگی کو متاثر کرنے والی اس شخصیت کی زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔چند کتب کے نام یہ ہیں: حیاتِ اشرف از غلام محمد عثمانی،افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ از مفتی محمد شفیع، اشرف الافادات از مولانا عبدالاحد سورتی، کمالاتِ اشرفیہ از مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی، معمولاتِ اشرفیہ نیز اشرف المعمولات از منشی علی محمد لاہوری ،تالیفاتِ اشرفیہ از مولوی عبدالحق فتح پوری ہسوی

۴۔خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی کتب اشرف السوانح اور خاتمہ السوانح مولانا تھانویؒ کے حوالے سے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی سلسلے کی ان کی تیسری کتاب حسن العزیز ہے۔

۵۔مولانا عبدالماجد دریابادی کو حضرت تھانویؒ سے خاص علاقہ تھا۔فتنۂ ارتداد سے اللہ کے فضل سے مراجعت ہوئی تو تلاشِ بسیار کے بعد حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ان کے اپنے بہ قول ''اپنے ہر نفسانی مرض کے علاج وتدبیر کے لیے اپنے ہر دینی وروحانی اشکال کے لیے،اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے برابر حضرت ہی کو زحمت دیتا رہا۔علاوہ سلسلۂ مراسلت کے بار بار سفر کر کے تھانہ بھون حاضر ہوتا۔کبھی چند گھنٹوں کے لیے بھی اور زیادہ تر کئی دن اور کئی کئی ہفتوں کے لیے، اور عجب پُر بہار ، پُرسرور، پُرکیف، پُرلطف وہ وقت ہوتا جو تھانہ بھون میں گزرتا'' (آپ بیتی)۔اپنے مرشد کے حوالے سے لکھی گئی

اس کتاب کے بارے میں مکتوب نگار اپنی خودنوشت آپ بیتی میں لکھتے ہیں: ''حضرت تھانویؒ کی وفات جولائی ۴۳ء میں ہوئی۔ اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر، حضرت کے خُطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالوں۔ خُطوط سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے؛ میرے اصل عریضے بھی اور ان ہی پر حضرت کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرتاً ضخیم ہی ہونا تھا۔ خیر خدا خدا کر کے کتاب ۵۰ء میں حکیم الامت یا نقوش و تاثرات کے عنوان پر تیار ہوگئی۔ اور ۵۲ء میں پریس سے باہر آ گئی۔'' (آپ بیتی)

۶۔ حضرت تھانویؒ کی زندگی کے بیش تر گوشوں کا احاطہ کرنے والی دو جلد پر مشتمل اس کتاب کا بنیادی ماخذ اشرف السوانح ہے۔ مؤلف منشی عبدالرحمان خان ملتانی پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''سیرتِ اشرف کا بنیادی سرمایہ چوں کہ اشرف السوانح ہے، اس لیے اس کے اقتباسات بلاحوالہ درج کیے گئے ہیں۔'' پیش لفظ ہی میں منشی صاحب حضرت تھانویؒ کا تعارف اس طرح کراتے ہیں: حضرت تھانویؒ کا ہر قول و فعل قرآن و سنت کی تنویر و تفسیر تھا۔ اور اس لحاظ سے حضرت تھانویؒ ایک بہترین انسان ہی نہیں، اس دور کے بے نظیر انسان بھی تھے، جن کی کتابِ زندگی کا ہر ورق درسِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے مقصود اور طریق دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔ جن کا کوئی قول و کردار ایسا نظر نہیں آتا جس سے زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ پر روشنی نہ پڑتی ہو اور علم و عمل کی راہیں نہ کھلتی ہوں۔'' (سیرتِ اشرف؛ ص: ۴۴) منشی عبدالرحمان خان ملتانی کی دیگر تصانیف میں مشاہداتِ واردات اور تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی کے نام ملتے ہیں۔ منشی صاحب ملتان سے جاری ہونے والے ماہ نامہ مجلہ کی ادارت بھی کرتے رہے۔

۷۔ اس دوران میں مکتوب الیہ جامعہ سندھ سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں 'اردو میں بچوں کا ادب' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے۔

۸۔ مولانا دریابادی کی رفیقۂ حیات کا انتقال یکم جنوری ۱۹۶۹ء کو ہوا تھا۔ اس صدمۂ جان کاہ کے موقع پر تعزیت کرنے پر مکتوب الیہ کو دُعا سے نواز رہے ہیں۔

۹۔ ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) کے ناولوں میں معاشرتی اصلاح اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا پہلو غالب ہے۔ ان کے ہاں دہلی کی مسلم معاشرت اور ٹکسالی زبان بالخصوص عورتوں کے محاورات اور دہلی شہر کی مسلم معاشرت کے عمدہ مرقعے ملتے ہیں۔ ان کے ناولوں بنات النعش اور مرات العروس کو کسی حد تک

بچوں یا نوعمر لڑکیوں سے متعلق تحریریں کہا جاسکتا ہے۔

۱۰۔مولانا محمد اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء) بچوں کے مشہور شاعر۔

۱۱۔الیاس احمد خان مجیبی (۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۸ء) کراچی میں مقیم بچوں کے ادیب تھے۔

۱۲۔ماہ نامہ سیّارہ کا آغاز نعیم صدیقی کی ادارت میں ۱۹۶۲ء میں لاہور سے ہوا۔سیّارہ نے ابتدا ہی سے مضامین میں نظریاتی بحثیں چھیڑیں۔مستقل سلسلے 'کتاب نامہ' میں ادیب اپنی کتابوں کا تعارف خود کراتے۔جون ۱۹۷۶ء میں اسے سہ ماہی رسالہ قرار دیا گیا۔تنقیدی، تحقیقی مضامین کے علاوہ تخلیقی اصناف افسانہ، انشائیہ، سفرنامہ، غزل، نظم وغیرہ کو بھی بھرپور نمائندگی دی گئی۔اقبالیات بھی اس پرچے کا اہم موضوعِ اظہار رہا۔سیّارہ نے مولانا مودودی کی ادبی جہت بھی دریافت کی۔سیّارہ ڈائجسٹ بھی سیّارہ ہی کی توسیعی شکل ہے۔(پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ)

۱۳۔سیّارہ نے معروف شاعر علامہ عبدالعزیز خالد کے حوالے سے ایک ضخیم 'عبدالعزیز خالد نمبر' پیش کیا تھا۔

۱۴۔یہاں صدق سے مراد مکتوب نگار کا پرچہ صدقِ جدید ہے۔سچ سے صدق اور پھر صدقِ جدید بننے کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا دریابادی اور عبدالرحمان نگرامی نے بہ طورِ شریک مدیر دینی، اصلاحی اور اجتماعی خیالات کے ترجمان ظفر الملک علوی کے پرچے سچ کا اجرا ۱۹۲۵ء میں ممکن بنایا۔۱۹۳۰ء کے عشرے میں سچ فرقہ وارانہ اور سیاسی مناقشات کا شکار ہوا تو صوبائی حکومت نے اس کی ضمانت طلب کی۔ظفر الملک سے اختلافات کی بنا پر مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے فیصلے کے تحت مولانا دریابادی نے انھیں کے تجویز کردہ نام صدق سے مئی ۱۹۳۵ء میں نیا پرچہ جاری کیا۔۱۹۵۰ء میں مالی مشکلات کی بنا پر یہ پرچہ بند کرنا پڑا۔اسی سال کے آخر میں دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی گئی تو صدق کے مہتمم نے دریاآبادی صاحب کو پرچے کا نام استعمال کرنے سے روک دیا۔چناں چہ انھوں نے دسمبر ۱۹۵۰ء میں صدقِ جدید کے نام سے اپنے مجلّے کی اشاعت شروع کردی۔(آپ بیتی از عبدالماجد دریابادی)

۱۴۔علامہ عبدالعزیز خالد کا شعری مجموعہ

۱۶۔میرزا صائب اصفہانی (متوفی ۱۰۸۰ ہجری) کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم جلد سوم میں لکھا ہے: ''ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہوگئی۔'' صائب کی ولادت

تبریز کے ایک معزز تاجر گھرانے میں ہوئی۔تعلیم وتربیت اصفہان میں ہوئی۔شاعری کی باقاعدہ تعلیم حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی سے حاصل کی۔فنِ شاعری میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد دہلی کا رخ کیا۔شاہ جہاں کے دربار سے ایک ہزاری منصب اور مستعد خان کا خطاب پایا۔مغل دربار کے مشہور تیموری امیر ظفر خان احسنؔ سے تعلقات استوار ہوئے تو ۱۰۴۳ ہجری میں اس کے ساتھ کشمیر کا سفر کیا۔یہیں سے وطن واپسی کا قصد کیا۔صائب عام ایرانی شعرا کے برعکس برِعظیم کے فارسی گوشاعروں کو بہ نظرِ تحقیر نہیں دیکھتے۔انھوں نے غنی کاشمیری اور فیضی کے شاعرانہ مقام کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی زمین پر غزلیں لکھیں۔(شعر العجم جلد سوم)

۱۷۔ٹیک چند بہار کی لغاتِ فارسی

۱۸۔نظامی گنجوی (۱۱۴۰ء تا ۱۲۱۰ء) کا پورا نام حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف ذکی بن موید ہے۔نظامی شعر وشاعری کے علاوہ تاریخ، ہیئت اور علمِ نجوم میں بھی دست رس رکھتا تھا۔پانچ مثنویوں کا مجموعہ پنج گنج یا خمسۂ نظامی مشتمل بہ مخزنِ اسرار، خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، ہفت پیکر، سکندر نامہ صنفِ شاعری میں اس کی دائمی شہرت کا باعث ہے۔نظامی کے پنج گنج کے جواب میں طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو شیریں بیاں (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) نے بھی پانچ تاریخی مثنویوں کا مجموعہ موسوم بہ پنج گنج یا خمسہ لکھا تھا۔اس مجموعے میں قران السعدین، مفتاح العلوم، مثنوی عشقیہ (دول رانی خضر خان)، نہ سپہر اور تغلق نامہ شامل ہیں۔(فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا، تاریخِ ادبِ اردو جلد اوّل از ڈاکٹر جمیل جالبی)

۱۹۔مولوی محمد سعید اور عبدالعزیز کی فارسی لغت۔ایک ایڈیشن کراچی سے شمس بریلوی کی نظرِ ثانی کے ساتھ شائع ہوا۔

کتب نما

ماہنامہ ''الحق'' کا شاہکار مولانا سمیع الحق شہید نمبر

مولانا محمد شفیع چترالی

[ماہنامہ النخیل میں کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، اس کے لیے النخیل انتظامیہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین سے رابطے میں ہے کہ کتاب کے موضوع کے اعتبار سے اہلِ علم مبصرین سے تبصرے لکھوائے جاسکیں، کتابیں'' ادارہ تراث الادب'' کے پتے پر بھیجی جائیں، تبصرے کے لیے دو کتابوں کا بھیجنا ضروری ہے۔ ادارہ]

ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک نے اپنے بانی مدیر شہید ناموس رسالت حضرت مولانا سمیع الحق شہید کی یاد میں چار جلدوں پر محیط تفصیلی نمبر شائع کر کے جہاں مجلّاتی صحافت کی تاریخ میں ایک خوبصورت باب کا اضافہ کیا ہے، وہیں حضرت شہید اسلام شہید ناموس رسالت کی محبتوں اور شفقتوں سے محروم ہونے والے ہم جیسے لاکھوں عقیدت کیش سوگواروں کی کچھ تسلی اور تسکین کا بھی سامان کر دیا ہے۔

برادر محترم مولانا راشد الحق سمیع مدیر ''الحق'' کی جانب سے الحق کے خاص نمبر کی تقریب رونمائی میں شرکت کا خصوصی دعوت نامہ موصول ہوا تھا، افسوس کہ کچھ عوارض کے باعث اس تقریب میں شرکت سے قاصر رہا مگر مولانا نے ازراہِ عنایت خاص نمبر ڈاک کے ذریعے ارسال فرما دیا، دیکھ کر دلی مسرت ہوئی اور بے اختیار داد دینے کو جی چاہا کیونکہ اس نمبر کی ترتیب وتبویب میں جہاں زبردست محنت اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے، وہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں خود حضرت شہید اسلام مولانا سمیع الحق شہید کے خاص ادبی و ادارتی ذوق کی پوری پوری رعایت کی گئی ہے

اور بہت خوبصورت انداز میں متعلقہ مواد کی درجہ بندی کی گئی اور الاہم فالاہم کے اصول کی پیروی کی گئی ہے۔

مولانا سمیع الحق شہیدؒ نے جس طرح اپنے بچپن کے دنوں میں ہی پیش آمدہ ذاتی، خاندانی، جماعتی اور قومی سطح کے واقعات کو ''ذاتی ڈائری'' کی شکل میں محفوظ کیا اور پھر وقت آنے پر مناسب ایڈیٹنگ کے بعد شائع کیا، پھر اپنے اور اپنے والد گرامی حضرت مولانا عبدالحقؒ کے نام آنے والے تمام خطوط، مکتوبات اور مراسلات کو محفوظ رکھا اور ترتیب اور سلیقے کے ساتھ ''مکتوبات مشاہیر'' کے نام سے ایک اہم تاریخی دستاویز کی صورت میں شائع کیا، اسی طرح دارالعلوم حقانیہ میں آنے والے وقت کے اکابر، اساطین علم اور مشائخ طریقت کے خطبات اور بیانات کو ضبط تحریر میں لا کر ''خطبات مشائخ'' کے نام سے تاریخی ریکارڈ کا حصہ بنایا، وہ انہی کا خاصہ تھا اور برصغیر کی تاریخ میں کسی دینی درسگاہ کی تاریخ کو اس طرح محفوظ کرنے کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔

مقام مسرت و اطمینان ہے کہ مولانا کی تربیت یافتہ ماہنامہ ''الحق'' کی ٹیم نے مولانا شہید کی یاد میں شائع ہونے والے خصوصی نمبر میں بھی مولانا کے اسلوب اور انداز کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور ماہنامہ الحق کی طرف سے اس کے بانی مدیر کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کو بہترین انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ دینی صحافت میں مولانا شہید کے خلف الرشید اور مولانا کی زندگی میں ہی ان کی سرپرستی و رہنمائی میں طویل عرصے سے الحق کی ادارت کا فریضہ بحسن و خوبی سرانجام دینے والے مولانا راشد الحق سمیع اور تصنیف و تالیف کا طویل تجربہ رکھنے والے معروف مصنف، محقق اور نقاد مولانا عبدالقیوم حقانی نے بڑی محبت، محنت اور لگن کے ساتھ اس خاص نمبر کو مرتب کیا اور ایک خوبصورت گلدستے کی صورت میں اہل علم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

خاص نمبر کی پہلی جلد میں مولانا عبدالقیوم حقانی کے قلم سے شہید اسلام مولانا سمیع الحق شہید کی سوانح حیات، ان کے دینی، علمی، سیاسی، صحافتی کارناموں کی تفصیل اور تذکرے کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کے ممتاز علماء اور اکابر کے مولانا شہیدؒ کے بارے میں مضامین، بیانات اور تاثرات کو شامل

کیا گیا ہے۔ مولانا راشد الحق اور مولانا شہید کے برادر عزیز مولانا انوار الحق حقانی کے مضامین گویا آنسوؤں میں قلم ڈبو کر لکھے گئے ہیں۔

سب سے پر تاثیر مضمون شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا ہے، جنہوں نے مولانا شہید کے ساتھ اپنی تقریباً سات دہائیوں پر محیط دوستی، بے تکلف تعلقات اور الفت و محبت کے واقعات کا ذکر چھیڑا اور گویا اپنا دل کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی، جمعیت علماء ہند کے امیر مولانا سید ارشد مدنی، مولانا محمود مدنی، مولانا نور عالم خلیل امینی، ندوۃ العلماء کے مولانا سید رابع حسنی ندوی، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سابق صدر علامہ ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، جمعیت علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمن، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا زاہد الراشدی، مولانا عیسیٰ منصوری، مولانا محمد احمد لدھیانوی، سینیٹر سراج الحق، حافظ محمد سعید، اعجاز الحق، عبداللہ گل، راجہ ظفر الحق، پیر اعجاز ہاشمی اور دیگر علماء اور دینی و قومی رہنماؤں نے اپنے اپنے مضامین میں مولانا شہید کی ہمہ جہت خدمات کا دل نشین انداز میں احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے معروف صحافیوں، کالم نگاروں، اہل قلم اور مدیران جرائد کی نگارشات بھی خاص نمبر کی زینت ہیں۔ عالم اسلام کی ممتاز شخصیات، دینی و قومی رہنماؤں کے تعزیتی بیانات کو بھی ریکارڈ کا حصہ بنایا گیا ہے۔

خاص نمبر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں خود مولانا شہید کے قلم جواہر رقم سے نکلے ہوئے متعدد اہم علمی و تحقیقی مضامین بھی پڑھنے کے لیے دستیاب ہیں جن سے مولانا کے علمی رسوخ اور ادبی دستگاہ کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی شخصیت پر خاص نمبر کی اتنی ضخامت بظاہر اچھنبے کی بات لگتی ہے لیکن اس خاص نمبر کا قاری اسے پڑھنے کے بعد اس کے مرتبین کے اس بیان سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا کہ ؎

حکایتے شیریں بود کہ دراز تر گفتم

☆......☆......☆

طب وصحت

ذیابیطس کتنی بڑی مصیبت ہے؟

وسعت اللہ خان

دوعشرے پہلے کا قصہ ہے کہ بی بی سی بش ہاؤس ریسٹورنٹ میں ایک مہمان ڈاکٹر نے اچانک پوچھا کہ آپ روزانہ کتنے کپ چائے پیتے ہیں۔ میں نے کہا شائد سات آٹھ۔اور چینی فی کپ کتنی استعمال کرتے ہیں۔ میں نے کہا دو چمچ۔ڈاکٹر نے شکردان سے سولہ چمچ چینی نکال کے طشتری میں ایک چھوٹی سی میٹھی پہاڑی بناتے ہوئے کہا ''تو یہ ہے وہ زہر جو آپ روزانہ جسم میں بلاضرورت انڈیل لیتے ہیں'' اور چہل قدمی کتنی کرتے ہیں ؟ میں نے کہا وقت ہی نہیں ملتا۔کبھی صبح کی شفٹ ہوتی ہے تو کبھی رات کی۔زیادہ سے زیادہ دفتر سے ٹیوب اسٹیشن اور وہاں سے چار پانچ سو گز پرے گھر تک۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کم ازکم تیس منٹ چہل قدمی تو چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت ہوسکتی ہے مگر ہم لوگ خود کو مصروفیت کے دھوکے میں رکھ کے ہر اہم غیر اہم کام کرتے ہیں سوائے خود پر آدھا گھنٹہ خرچ کرنے کے۔خود کو یونہی دھوکا دیتے رہے تو یہ جسم ایک بار ہی اچانک پٹخنی دے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ کو روزانہ آٹھ کپ چائے میں سولہ چمچ چینی ڈالنی ہے تو پھر مسلسل بیٹھ کے کرنے والی نوکری آپ کے لیے مناسب نہیں۔پھر آپ جسمانی مزدوری کیجیے تاکہ جسم وہ چینی ہضم کر سکے جس کی اسے ہرگز ہرگز ضرورت نہیں۔جو سبزیاں، پھل حتیٰ کہ روٹی آپ کھاتے ہیں ان میں قدرتی شوگر اتنی ہوتی ہے کہ جسم کی شوگر کی بنیادی ضرورت خود بخود پوری ہوجاتی ہے۔جسم کو الگ سے مصنوعی چینی اور مٹھائیاں کھلانا ایسے ہے جیسے کسی مہمان کا پیٹ بھرا ہو پھر بھی آپ اس کے منہ میں کھانا ٹھونسنے پر بضد ہوں۔ظاہر ہے یا تو اسے قے آجائے گی یا پھر میزبان سے نفرت ہوجائے گی لہٰذا جسم سے اتنا ہی پیار کریں جتنی ضرورت ہے ورنہ ''اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے'' والا معاملہ ہوسکتا ہے۔

وہ دن اور آج کا دن اب میری زبان پھیکی چائے کی عادی ہو چکی ہے۔ میٹھی چائے کے دو گھونٹ بھی نہیں برداشت ہوتے اور جسم نے کبھی پلٹ کر شکوہ نہیں کیا کہ یہ تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو۔

ویسے بھی کہتے ہیں کہ لائف اسٹائل تبدیل کرنے میں ایک ماہ اور عادت بدلنے کے لیے کم از کم تین ماہ درکار رہیں۔ دو عشرے پہلے میں نے چینی ترک کی تو ذیابیطس کے خوف سے نہیں بلکہ طبی منطق سے قائل ہو کر کی۔ آج ساٹھ برس کی عمر میں بھی اب تک اوپر والے نے ذیابیطس سے بچا رکھا ہے۔ مگر کب تک؟ یہ میں نہیں جانتا۔ روزمرہ پریشانیاں میرے حصے میں بھی اتنی ہی ہیں جتنی کسی بھی انسان کے حصے میں آتی ہیں۔ مگر ان پریشانیوں کو ذیابیطس کا ایک بڑا سبب بننے سے پہلے ہی چالیس منٹ کی چہل قدمی سے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلسل ذہنی پریشانی اور نیند کی اتھل پتھل بھی آپ کے لبلبے پر اثر انداز ہوتی ہے اور پھر جب ایک دن آپ پر حقیقت کھلتی ہے تو پہلی گالی آپ ڈاکٹر کو دیتے ہیں کہ چینی تو میں استعمال نہیں کرتا پھر شوگر کیسے ہو گئی۔ لہٰذا منا بھائی ایم بی بی ایس کا یہ فارمولا بھی برا نہیں کہ ''ٹینشن لینے کا نہیں دینے کا۔''

دو ہزار تین کی عراق امریکا جنگ کے دوران ڈیڑھ ماہ قاہرہ میں بھی گذرا۔ یہ شہر نہ رات کو سوتا ہے نہ دن میں۔ شام ڈھلے سے فجر تک پرانے قاہرہ کے چائے خانے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں اور قہوے پر قہوہ انڈلتا چلا جاتا ہے۔ مصری کہتے ہیں کہ وہ قہوہ ہی کیا جس میں اتنی چینی نہ ہو کہ چمچ کھڑا ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذیابیطس مصر کی قومی بیماری قرار دی جا چکی ہے۔ پینتیس فیصد آبادی اس میں مبتلا ہے اور کروڑوں روپے کی چینی اربوں روپے کا علاج کروا رہی ہے۔ صرف مصر ہی کیا۔ اگر پورے شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطی کو دیکھا جائے تو ہر چھٹا شخص (تہتر ملین نفوس) ذیابیطس کا شکار ہے۔

اس قدر بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہر سال کی طرح اس بار بھی بارہ نومبر کو عالمی یومِ ذیابیطس منایا گیا۔ اس موقعے پر بین الاقوامی ڈائبیٹک فیڈریشن (آئی ڈی ایف) کی تازہ رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر دسواں شخص (پانچ سو سینتیس ملین) ذیابیطس میں مبتلا ہے۔ یہ تعداد دو ہزار انیس کے مقابلے میں انیس فیصد بڑھی ہے۔ ان میں سے ایک سو چالیس ملین چین میں، چوہتر ملین بھارت میں اور تینتیس ملین پاکستان میں ہیں۔ یعنی ذیابیطس کی عالمی رینکنگ میں پاکستان تیسرے نمبر پر ہے۔ اضافی طور پر گیارہ ملین پاکستانی امپیریڈ گلوکوز ٹولرینس (آئی جی ٹی) کا شکار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی وقت ٹائپ ٹو

ذیابیطس میں مبتلا ہونے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

ایک چوتھائی سے زائد (چھبیس اعشاریہ نو فیصد) کو معلوم ہی نہیں کہ وہ ذیابیطس میں جکڑے جا چکے ہیں۔ایسے مریض جو علاج درمیان میں چھوڑ دیتے ہیں، وہ امراضِ قلب، گردوں کے ناکارہ پن، نابینگی اور پیر یا ٹانگ کٹنے کے خطرات کے لیے صلائے عام بن جاتے ہیں۔ان حالات میں اہلِ خانہ کے لیے مریض کی طبی و دیکھ بھالی مالیاتی و جذباتی قیمت کس قدر ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

ہر سال پاکستان میں چار لاکھ اموات ذیابیطس کے سبب ہوتی ہیں۔ہر چوتھا پاکستانی اس میں مبتلا ہے یا مبتلا ہوا چاہتا ہے۔یعنی دو ہزار انیس سے اب تک ذیابیطس کے شکار مریضوں کے تخمینے میں ستر فیصد کا اضافہ ہو چکا ہے۔ان میں سے چالیس فیصد یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ مبتلا ہیں۔کیونکہ نہ تو طبی سہولتیں کافی ہیں اور جہاں ہیں بھی وہاں ہر شخص اپنا معالج خود بن کے ذیابیطس سے بھی خطرناک مرض یعنی خود تشخیصی میں مبتلا ہے۔یہ افلاطون تب ہی طبی معائنے پر راضی ہوتا ہے جب جسم جوتا پکڑ کے مارنا شروع کر دے۔

اس برس انسولین کی دریافت کی صدی مکمل ہوگئی،مگر سو برس بعد بھی ذیابیطس میں مبتلا ہر دوسرے شخص کی انسولین تک یا تو رسائی نہیں یا وہ اسے خریدنے سے قاصر ہے۔ذیابیطس کے مریضوں کی نوے فیصد عالمی آبادی ٹائپ ٹو ذیابیطس میں مبتلا ہے۔اس کے موٹے موٹے اسباب میں غربت، گنجانیت سے جڑے مسائل، جسمانی ورزش کی اہمیت نہ جاننا، موٹاپا اور توندیلا پن بتائے جاتے ہیں۔ذیابیطس کی فوری تشخیص ہو سکے تو اسے پسپا بھی کیا جا سکتا ہے یا ذیلی اثرات کو کم سے کم سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔

دو ہزار اکیس میں ذیابیطس سے جڑے مسائل کے علاج معالجے کے عالمی اخراجات نو سو چھیاسٹھ ارب ڈالر تک جا پہنچے ہیں۔یعنی پچھلے پندرہ برس میں ان اخراجات میں تین سو سولہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہماری توجہ گزشتہ دو برس سے کووڈ سے ہونے والی ہلاکتوں پر ہے۔مگر اس حقیقت کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی کہ دو ہزار اکیس میں اکتوبر تک سڑسٹھ لاکھ افراد ذیابیطس یا اس کے سبب ہونے والی جسمانی پیچیدگیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں۔

کیا اب بھی کوئی یہ ماجرا پڑھ کے کہے گا کہ ’’سب سے پہلے تو گھبرانا نہیں ہے۔‘‘

☆......☆......☆

مسافرانِ آخرت

مولانا حافظ نثار احمد الحسینی ؒ

حضرت مولانا نثار احمد الحسینی رحمۃ اللہ علیہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۱۴ دسمبر ۲۰۲۱ء حضرو، چھچھ ضلع اٹک (پنجاب، پاکستان) میں ۵۸ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء کو حضرو میں ہی پیدا ہوئے۔ اپنے علاقے میں ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب (شاہ ڈھیروی) سے ھدایۃ اور مشکوٰۃ شریف تک کی کتابیں پڑھیں اور پھر گوجرنوالہ میں امام اہلسنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ سے تفسیر پڑھی، بعد ازاں ۱۹۹۲ء میں جامعہ اشرفیہ، لاہور میں دورہ حدیث میں داخلہ لیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ تصوف میں آپ حضرت مولانا زاہد الحسینی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔

فراغت کے بعد آپ اپنے علاقے حضرو میں ہی تدریسی خدمات سے وابستہ ہو گئے، جو تادمِ آخر جاری رہیں۔ آپ علمی رسوخ کے مالک اور حقیقی معنوں میں ایک ربانی عالم دین تھے۔ آپ کا تکلم علم کا غماز، نشست و برخاست حلم و وقار سے آراستہ اور مجلس اخلاق و آداب سے مزین ہوتی تھی۔ آپ وافر حلم کے حامل اور کئی روحانی نسبتوں سے موصوف تھے لیکن اس کے باوجود نہ علمی تعلیٰ تھی اور نہ ان نسبتوں پر فخر و غرور تھا۔

بانی النخیل مولانا ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ سے گہرے مراسم رہے، آپ حضرت کے یہاں حضرو میں مقیم رہتے۔ آپؒ مطالعہ کا فطری ذوق رکھتے تھے، آپ کے ذاتی کتب خانہ کا شمار حضرو و اٹک کے بڑے کتب خانوں میں ہوتا تھا۔ آپ "تسہیل الوصول الی علم الاصول"، "قواعد قرأت"، "خانقاہی نظامِ تربیت" اور "اکابر علماء دیوبند اور حضرت شیخ الحدیث غور غشتی کا عقیدہ" سمیت کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کی نمازِ جنازہ بوائز ڈگری کالج حضرو میں ادا کی گئی۔

☆......☆......☆

اردو ادب

تو کیا "بربریت" بُری بات ہے؟

احمد حاطب صدیقی

[احمد حاطب صدیقی (پیدائش: ۰۳ فروری ۱۹۵۶ء) ایک پاکستانی کالم نگار، مزاح نگار، شاعر اور بچوں کے ادیب ہیں، بچوں کے لیے شاعری بھی کرتے ہیں، ان کی نظم "یہ بات سمجھ میں آئی نہیں" بہت مشہور ہوئی ہے۔ آپ کراچی کے ایک جریدے میں "ابونثر" کے قلمی نام سے "غلطی ہائے مضامین" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔]

ایک مؤقر تعلیمی ادارے کی سالانہ تقریب ہو رہی تھی۔ ہم بھی تھے مہمان گئے۔ مہمان سے پہلے میزبان مقررین کا تانتا بندھ گیا۔ مقررین میں نہ صرف طلبہ و طالبات بلکہ معلّمین و معلّمات کی بھی اچھی تعداد تھی۔ کچھ مختصر دورانیے کے تمثیلی تماشے بھی بیچ بیچ میں بھیس بدل بدل کر دکھائے جاتے رہے۔ تقریب چوں کہ عشا بعد شروع ہوئی تھی، چناں چہ منہ سے جھاگ برساتی تقریروں اور آنکھیں نم کر دینے والے تماشوں سے رات بھیگنے لگی۔ انشاؔ جی والا ڈر ہمیں بھی لگنے لگا کہ

شب بیتی چاند بھی ڈوب چلا زنجیر پڑی دروازے میں
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو سجنی سے کرو گے بہانا کیا؟

جب لوگ جگر تھام کے بیٹھ گئے، تب ہماری باری آئی۔ اس وقت تک مقررین کی "بربریت" سے خود ہمارا بُرا حال ہو چکا تھا۔ مذکورہ تعلیمی ادارے میں سالانہ تقریبات کا ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ اُس تقریبِ شب کا موضوع اقبالؔ کا کلام اور پیغامِ اقبالؔ تھا۔ یقین کیجیے کہ مقررین کی تقریباً پچھتر فیصد

تعداد نے، جن میں طلبہ وطالبات اور معلّمین ومعلمات سب ہی شامل تھے، اپنی تقریروں میں تکرار کے ساتھ "بربریت" کا خوب، خوب استعمال کیا۔ اپنی باری پر ہم نے طلبہ واساتذہ دونوں سے سوال کیا کہ:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلی بربریت کس نے برپا کی تھی؟"

تو کیا اُستاد اور کیا طالب علم، سب ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ عرض کیا:

"اے عزیزو! ابھی ابھی جو آپ کے باصلاحیت طلبہ نے اقبالؔ کی نظم "طارق کی دُعا" اور پُر اثر تمثیلی خاکہ پیش کیا ہے، یہیں سے تو 'بربریت' کی ابتدا ہوئی تھی۔"

ہماری بات سُن کر سب حیران رہ گئے۔ منتظمین بھی پریشان ہو ہو کر ایک دوجے کو دیکھنے لگے کہ یہ ہم نے کس بے وقوف کو بُلا لیا۔

ہم نے طلبہ وطالبات کو مخاطب کر کے بتانا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کے جنوب مغربی گوشے 'ہسپانیہ' میں کوہِ پیرینیز کے پار انتہائی وحشی قبائل رہا کرتے تھے۔ یہ قبائل 'قوطیہ' یا Goth قبائل کہے جاتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ سلطنتِ روما کے مطیع تھے، مگر رومن بھی انھیں اپنی سرحدوں سے دور دھکیلتے رہتے تھے۔ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائیوں میں جب یہاں ظلم، تشدد، درندگی، بہیمیت اور وحشت بہت بڑھ گئی تھی اور لوگ وہاں کے حکمرانوں کی حیوانیت سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے تو ساحلی شہروں کے ایک نواب جولیاں نے شمالی افریقا کے مسلمانوں سے مدد مانگی۔ شمالی افریقا کے مسلمانوں کا تعلق "بربر قبیلے" سے تھا۔ اُس وقت شمالی افریقا کے گورنر موسیٰ بن نُصَیر تھے۔ پہلے موسیٰ بن نُصیر اور بعد میں اُن کے بربر سپہ سالار طارق بن زیاد نے ان مظلوموں کی پُکار پر لبیک کہتے ہوئے ظالم حکمرانوں اور اُن کے لشکریوں کی، طلبہ کی زبان میں، ایسی "کُٹ" لگائی کہ اہلِ یورپ آج تک اُس مار کو "Barabarism" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لفظ کو ہمارے مغرب پسندوں نے بغیر پس منظر جانے، بے سوچے سمجھے اور آنکھیں موند کر اُردو میں "بربریت" کا جامہ پہنا دیا۔

اس کالم کا موضوع تاریخ نہیں۔ ورنہ مذکورہ تعلیمی ادارے کے طلبہ و طالبات اور معلّمین و

معلمات کی طرح ہم اپنے قارئین وقاریات کو بھی اُس زمانے کی کچھ جھلکیاں دکھاتے۔ان جھلکیوں سے اندازہ ہوجاتا کہ ظلم، تشدد، درندگی، بہیمیت، وحشت، جہالت، کفراور شرک کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے یورپ کو ُبربر' مسلمانوں نے کس طرح امن، انصاف، علوم، فنون، تہذیب، تمدّن اور ایمان واسلام کے نور سے جگمگا کر رکھ دیا۔

مسدسِ حالی میں مولانا حالی فرماتے ہیں:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے   یہ سب پود اُنھیں کی لگائی ہوئی ہے

'بربریت' سے تعلق رکھنے والوں میں فقط طارق بن زیاد اور یوسف بن تاشفین جیسے جرنیل اور حکمران نہ تھے، امام غزالی اور ابن خلدون بھی 'بربر' تھے۔مشہور سیاح ابن بطوطہ کی عطا کی ہوئی جغرافیائی اور سیاحتی معلومات کو بھی 'بربریت' میں شمار کیجیے۔ابن بطوطہ کی 'بربریت' کا ذکر تو مولانا الطاف حسین حالی بھی کیے بغیر نہ رہ سکے۔مسلمانوں کی تحریکِ اِحیائے علوم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

سدا اُن کو مرغوب سیر و سفر تھا   ہر اِک براعظم میں اُن کا گزر تھا
تمام اُن کا چھانا ہوا بحر و بر تھا   جو لنکا میں ڈیرا تو بربر میں گھر تھا

اہلِ علم وادب کی زبان سے سُن کر ہی نہیں، جدید لغات میں 'بربریت' کے معانی پڑھ کر بھی مزید ملال اور سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے کن کن اکابر سے کیا چیز منسوب کی جارہی ہے۔شان الحق حقی کی مرتب کردہ اور مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ "فرہنگِ تلفظ" میں بھی، نہ "بربر" کے معنی دیے گئے ہیں نہ "بربری" کے۔مگر "بربریت" کے معانی 'وحشت، جنگلی پن، زور اور ظلم' ضرور دیے گئے ہیں۔ جب کہ قدیم لغات میں ہمیں 'بربریت' کا لفظ ہی نہیں ملتا۔

الفاظ کے معنوی اور اصطلاحی پس منظر پر بھلا اہلِ لغت سے زیادہ تحقیق کون کرتا ہوگا؟ اہلِ مغرب نے مسلمانوں سے عناد کے اظہار کے لیے اور اپنی عسکری ہزیمت پر کھسیاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے Barbarism کی اصطلاح کو خلافِ انسانیت اعمال وافعال کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔اس انگریزی اصطلاح کے اُردو متبادل کے طور پر 'بربریت' کو ظلم وتشدد کے معنوں میں

استعمال کرنے والے اپنے دانشوروں سے توقع تھی کہ وہ اس مغربی عناد اور بدنیتی کو سمجھ گئے ہوں گے۔ مگر مغرب کی اندھا دھند تقلید کی عادت نے نگاہوں، دلوں اور دماغوں پر دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ طارق بن زیاد، یوسف بن تاشفین، ابو حامد محمد الغزالی، عبدالرحمٰن ابن خلدون اور ابوعبداللہ محمد ابن بطوطہ جیسے بربروں کے کارناموں کی روشنی میں تو حریتِ انسانی، علم، اخلاق، تہذیب، فلسفہ، تاریخ نگاری، سیر و سیاحت اور سفرنامہ نگاری کو 'بربریت' کہنا چاہیے۔ ظلم اور تشدد کے معنوں میں 'بربریت' کا لفظ استعمال کرنا خود ظلم ہے، اُن اکابر کے ساتھ جنھوں نے یورپ کے مظلوم مسیحیوں کو نہ صرف آزادی و حریت سے ہم کنار کیا بلکہ علم، اخلاق، تہذیب اور تمدن سے بھی آشنا کیا۔ ان احسانات کے بدلے میں ظلم کو 'بربریت' قرار دینا ظلم ہی نہیں 'تشدد' بھی ہے، یعنی اُس شدّت پسندی کی تقلید ہے جو اہلِ مغرب مسلمانوں کے خلاف روا رکھتے ہیں۔ ورنہ غیر انسانی اعمال و افعال کے لیے ہم جتنی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی معنوی پس منظر ہے۔ 'درندگی' کا پس منظر یہ ہے کہ درندے اپنے شکار کو بے رحمی سے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کسی کو 'وحشی' کہا جائے یا کسی کی حرکتوں کو 'وحشیانہ' قرار دیا جائے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ 'وحش' جنگلی جانور کو کہتے ہیں، جس کی جمع 'وحوش' ہے۔ 'بہیمیت' کا لفظ دیکھیے تو اس کی اصل 'بہیمہ' ہے یعنی حیوان اور اس کی جمع 'بہائم' ہے۔ 'بہیمیت' سے مراد 'حیوانیت' ہے جو آج کل ہر طرف دکھائی جا رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ظلم و ستم، جور و جبر، زور، زبردستی، تعذیب و تشدد، درندگی و بہیمیت، وحشت و سنگ دلی اور جنگلی پن یا حیوانیت جیسے بامعنی الفاظ کی بکثرت میں آپ کو کیا مار آئی ہوئی ہے کہ کسی کے جال میں پھنس کر، کسی کی چال میں آ کر 'بربروں' کو بدنام کرتے پھریں؟

مسافرانِ آخرت

مولانا محمد نعمت اللہ چترالیؒ

جامعہ دارالعلوم کراچی کے ناظم اور قدیم استاذ حضرت مولانا محمد نعمت اللہ چترالی صاحب رحمہ اللہ ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۲۰ اور ۲۱ دسمبر ۲۰۲۱ء کی درمیانی رات ۶۳ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے، آپ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے تلمیذِ خاص، خادم خاص اور کاتب بھی رہے، مولانا محمد نعمت اللہ صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کا آخری فتویٰ جو آپ نے وفات سے تقریبا آدھا گھنٹہ قبل تحریر کرایا، وہ آپ کے ہی قلم سے لکھا گیا۔

مولانا محمد نعمت اللہ صاحبؒ نے اپنی درسِ نظامی کی تعلیم جامعہ دارالعلوم کراچی میں مکمل کرنے کے بعد تخصص فی الفقہ بھی دارالعلوم میں ہی کیا، بعدازاں آپ دارالعلوم کے استاذ مقرر ہوئے اور تاحیات اس عہدے پر فائز رہے، آپ نے اپنی ساری زندگی انتہائی سادگی اور گمنامی کے ساتھ جامعہ دارالعلوم اور وہاں کے طلبہ کی خدمت میں گزاردی۔ زمانہ طالب علمی سے لے کر روزِ وفات تک آپ جامعہ دارالعلوم کراچی کے نہ جانے کتنے ہی اہم کاموں میں مشغول رہے۔ دارالعلوم میں آپ کی خدمات کا دورانیہ نصف صدی کے قریب ہے۔

آپ کی نمازِ جنازہ ۲۱ دسمبر کو بعد نمازِ ظہر جامعہ دارالعلوم کراچی میں دارالعلوم کے استاذِ حدیث مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب کی اقتدا میں ادا کی گئی۔ جس میں دارالعلوم کے طلبہ سمیت اہلِ علم بڑی تعداد میں شریک ہوئی۔ بعدازاں آپ کو جامعہ دارالعلوم کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

ماہنامہ النخیل کے مدیر مولانا محمد شفیع چترالی صاحب آپ کے داماد ہیں۔ آپ نے بیوہ، پانچ بیٹوں، تین بیٹیوں سمیت ہزاروں تلامذہ سوگوار چھوڑا۔